DAMAGE BOOK

DAMAGE BOOK

UNIVERSAL LIBRARY
OU_222164
UNIVERSAL LIBRARY

OUP—39. 29-4-72—10,000.
Checked 1978
OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY
Call No. Accession No. 17775
Author
Title
This book should be returned on or before the date last marked below.

بار اول
تعداد ایک ہزار
قیمت تین روپے
ناشر۔ چمن بک ڈپو دہلی
مطبوعہ۔ خواجہ پریس دہلی

اس ناول کے تمام کردار، مقامات، واقعات اور ادارے فرضی ہیں اور ان کا کسی شخص جگہ، واقعہ یا ادارے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کسی فرد، مقام یا ادارے سے مطابقت قطعی اتفاقیہ ہے اس کے لئے مصنف یا پبلشرز کسی طرح کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتے۔

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی؟
ہزاروں اُٹھ گئے رونق وہی باقی ہے مجلس کی

پہلا باب

مرزا افضل بیگ اوسط درجے کے لوگوں میں تھے۔ غدر میں جب بڑے بڑے رؤسا ٹکڑوں تک کو محتاج ہو گئے تھے تو ان کے والد مرحوم بھی اسی زمانے میں شہر چھوڑ کر شاہ نگر آ بسے تھے۔ جان بچنے کو تو بچ گئی لیکن مالی حالت اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ پیٹ بھرنا تو رہا درکنار تن ڈھانکنا بھی دوبھر تھا۔ یہی وجہ ہوئی کہ ان کا خیال افضل بیگ کی تعلیم سے ہٹ کر پیٹ بھرنے کی طرف لگ گیا۔ اور اس طرح ان کا اکلوتا بیٹا صرف مڈل تک تعلیم حاصل کر سکا۔ بہت کافی بھاگ دوڑ کرنے کے بعد ڈاک خانے میں پوسٹ مین کی جگہ مل سکی۔ گھر کے لوگ یہ سن کر کہ افضل بیگ کو ملازمت مل گئی پھولے نہ سماتے تھے۔ گھر کے اخراجات بڑے آرام سے پورے ہونے لگے۔ وجہ یہ تھی کہ گھر میں گنتی کے بس چار آدمی تھے۔ ایک افضل بیگ کی بیوہ بہن جس کا شوہر غدر کی تیز و تند آندھی کی نذر ہو گیا تھا ایک ماں اور ایک باپ۔ ان چاروں کے لئے دو آدمیوں [illegible] [illegible] کافی تھا،

اب زندگی کے دن کٹتے ہوئے پتہ نہ چلتا تھا۔

دو سال گزر گئے، افضل بیگ کی والدہ نے دور اندیشی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تھوڑا سا اثاثہ اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ ادھر افضل بیگ بھی جوان ہو چکا تھا، ماں اور باپ دونوں نے آپس میں مشورہ کرکے اسی قصبہ میں ایک رئیس کے ہاں شادی کا پیغام ڈال دیا۔ وہ زمانہ ہر اُس آدمی کے لئے جس کے ہاں جوان لڑکی بیٹھی ہوئی تھی بڑا ہی نازک تھا۔ کیونکہ چھوٹے سے لے کر بڑے تک ہر ایک نے خونی انقلاب دیکھا تھا۔ دو تین سال گزر جانے پر بھی کسی کو یہ یقین نہ تھا کہ آنے والا دن اطمینان سے گزرے گا۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ خوف کھائے ہوئے تھا۔ یہی وجہ تھی کہ زمیندار صاحب نے بغیر کسی چھان بین کے پیغام منظور کر لیا۔ اس سلسلہ میں جو کچھ کارروائی ہوئی اُس کا علم افضل بیگ کو بالکل نہ تھا۔ وہ زمانہ ہی کچھ اور تھا، بڑے بوڑھے جو کچھ طے کر دیا کرتے تھے وہ پتھر کی لکیر ہوتا تھا۔ چھوٹوں کی کیا مجال کہ اس کو ذرا بھی ٹال سکیں۔ یہی وجہ تھی کہ افضل کو کانوں کان بھی کسی بات کا پتہ نہ چل سکا۔ اوپر ہی اوپر فریقین نے بات طے کر لی۔

اِدھر منگنی ہوئی اُدھر تبادلہ کا پروانہ آگیا، سرکاری ملازمت۔ انکار کرے تو ملازمت سے جواب اور اقرار کرے تو ماں باپ سے جدائی۔ مگر جہاں تک روزی کا سوال ہے اس سے انکار کرنا فاقہ کشی کو دعوت دینا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ افضل بیگ نے بلا چون و چرا اپنے تبادلہ کے فارموں پر دستخط کر

اس کو جس دن سے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ جلد ہی ماں باپ سے جدا ہو جائے گا دل پر گہرا اثر لیے رہا تھا۔ نہ معلوم کتنے خیالات آتے اور ختم ہو جاتے تھے۔ ادھر والدین بھی اپنے اکلوتے کو حسرت سے اس طرح دیکھتے کہ شاید وہ پھر کبھی نہ دیکھیں گے۔ اس کا دل وہاں سے اُچاٹ ہو چکا تھا۔ دل پر ایک خوف یہ بھی طاری تھا کہ نئی جگہ جا رہا ہوں نہ معلوم کیسے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔

بالآخر وہ دن بھی سر پر آن کھڑا ہوا کہ افضل بیگ کو صبح سویرے اُٹھکر اپنا بوریا بستر گول کرنا پڑا۔ ماں باپ بہن تینوں نے باری باری افضل بیگ کو اپنی چھاتی سے لگایا۔ ان چاروں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی۔ مجبوراً افضل بیگ خدا حافظ کہتا ہوا اپنے والد کے ساتھ گھر سے رخصت ہوا۔ اس کی والدہ اور بیوہ بہن دروازے پر کھڑی ہوئی ٹکٹکی باندھے اس کو دیکھ رہی تھیں۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو مایوس ہو کر گھر میں آ کر لیٹ گئیں۔

روانگی کی خبر افضل بیگ کی سسرال والوں کو بھی مل گئی تھی۔ اسی لئے زمیندار صاحب بھی بستی کے باہر سڑک پر اپنے ہونے والے داماد کا انتظار کر رہے تھے۔ افضل بیگ کے والد سے دعا سلام کے بعد انھوں نے بیل گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ رسمی طور پر انکار بھی کیا مگر زمیندار صاحب کے اصرار پر یہ دونوں باپ بیٹے گاڑی میں سوار ہو کر شہر کی طرف روانہ ہو گئے۔ افضل بیگ نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا کہ زمیندار صاحب بھی اُسی طرح کھڑے ہوئے دیکھ رہے

ہی جس طرح اس کی والدہ اور بہن دروازے پر کھڑی ہوئی تھیں۔ دل میں سوچنے لگا کہ یہ ماجرا کیا ہے یہ زمیندار صاحب اتنے مہربان کیوں ہو رہے ہیں؟ — اپنی گاڑی بھی دی اور اتنی دور تک چھوڑنے بھی آئے۔ کئی بار ہمت بھی کی کہ وہ اس بارے میں اپنے والد سے معلوم کرے مگر خاموش ہو کر رہ گیا۔ اس کے والد جو برابر میں بیٹھے ہوئے تھے جب اس کو دیکھتے وہ فوراً اپنی نگاہ دوسری طرف پھیر لیتا۔ کافی دیر تک یہی صورت رہی۔ قریب تھا کہ زمیندار بھی نظروں سے اوجھل ہو جائیں، باپ نے بیٹے کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

مرزا تم پریشان نظر آ رہے ہو۔ تمہارے چہرے کا رنگ پھیکا سا پڑ گیا ہے۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئے اور افضل بیگ کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن وہ اُن کے سوال کا کوئی جواب نہ دے سکا ———— وہ زمانہ ہی ایسا تھا کہ بڑوں کے سامنے زبان کو جنبش دینا آسان نہ تھا۔ کوئی دو منٹ انتظار کرنے کے بعد پھر انھوں نے سوال کیا۔ افضل بیگ نے ڈرتے ڈرتے گردن جھکائے جواب دیا۔

میں یہ سوچ رہا ہوں کہ زمیندار صاحب نے خواہ مخواہ کیوں اتنی تکلیف اٹھائی۔

اتنا کہہ کر افضل بیگ پھر کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ وہ یہ سوچنے لگا کہ بات یہیں تک ہی ختم ہو جائے گی، مگر تو یہ کرو۔ اس کے والد بڑے نگاہ باز تھے، اُن کو اس مختصر جواب کیا اطمینان ہوتا، کہنے لگے۔

برخوردار تمہاری یہ بات ہمارے دل کو نہیں لگی۔ خیر اگر تم چھپانا چاہتے ہو

تو تمہاری مرضی۔

افضل بیگ کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ البتہ گاڑی بان کبھی کبھی مڑ کر دیکھتا اور باپ بیٹوں کی گفتگو سن کر مسکراتا ہوا دوسری طرف منہ پھیر لیتا۔ زمیندار بھی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ ادھر افضل بیگ کا دھیان بھی بٹ چکا تھا۔ اب نظروں کے سامنے کوئی ایسی چیز نہ تھی کہ جس کو بحث کا موضوع بنایا جا سکے۔ گاڑی کے ہچکولوں نے افضل بیگ کے والد کو نیند کی دعوت دی اور وہ خراٹے بھرنے لگے۔ اچانک گاڑی کا پہیہ ایک گڑھے میں گرا، افضل بیگ کا سر گاڑی بان سے ٹکرا گیا۔ دونوں چوکنّے ہو گئے۔ افضل بیگ کچھ جھینپ سا گیا اور گھبراتا ہوا گاڑی بان سے بولا۔

چودھری صاحب معاف کر دینا...... اچانک نیند آ گئی اور سر ٹکرا گیا۔ چوٹ تو نہیں لگی؟

اس میں معافی کی کیا بات۔ ایسا تو ہو ہی جاتا ہے اور چھوٹے بابو جی، دراصل یہ ہے کہ...

وہ اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ افضل بیگ کے والد کی آنکھ کھل گئی۔ اُن کی بڑی بڑی آنکھیں دیکھ کر گاڑی بان دم بخود ہو گیا۔ بات ادھوری رہ گئی۔ جو کچھ گاڑی بان کہنا چاہتا نہ کہہ سکا۔

یہ سب کچھ اُن کے رعب اور بزرگی کے باعث ہوا۔ افضل بیگ کے والد کو غریب گاڑی بان کی خاموشی بھی برداشت نہ ہو سکی اور بالکل حاکمانہ انداز میں

جیسے وہ اُن کا زرخرید غلام ہے چلاتے ہوئے بولے۔

"خاموش کیوں ہو گئے ہو؟"

گاڑی بان خوفزدہ ہو کر کانپنے لگا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر افضل بیگ اپنے والد سے مخاطب ہو کر بولا۔

"ابا جان ...."

خاموش رہو جی! میں کچھ نہیں سننا چاہتا —— سوال میرا تم نہیں ہے۔ وہ بھی زبان رکھتا ہے۔ گونگا نہیں۔ چیونٹی بن کر پہاڑ پر چڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کہاں ہم اور کہاں یہ۔ اپنی اوقات بھول گیا جو کچھ اُن کے منہ میں آیا کہا، افضل اور گاڑی بان دونوں گردن جھکائے سنتے رہے۔ تمام راستہ خاموشی کے ساتھ طے ہو گیا۔ لیکن افضل بیگ کو اپنے والد کی یہ بات کہ غریب گاڑی بان کو حقیر سمجھتے تھے ناگوار گذری۔ مگر کہتا مجبور تھا۔

شہر پہنچ کر یہ تینوں ایک سرائے میں ٹھہر گئے۔ بیچارے گاڑی بان کو چارپائی بھی نصیب نہ ہو سکی۔ جیسا کھانا ملا انھوں نے دیا صبر کر کے حلق سے اتارا، اور اپنی چادر بچھا کر گاڑی ہی میں لیٹ گیا۔ افضل بیگ اور اُس کے والد الگ الگ چارپائیوں پر لیٹ گئے۔ کچھ دیر بعد افضل بیگ کو غریب گاڑی بان کا خیال آ گیا۔

اُس کے پاس نہ بستر ہے اور نہ ہی کوئی چارپائی۔ آخر وہ بھی انسان ہے اُس کو بھی ان چیزوں کی ضرورت ہے۔ اپنے والد کو خاموش دیکھ کر سمجھا کہ

انھیں نیند آگئی ہے۔ تھوڑی دیر انتظار کرکے اپنی چارپائی سے اُٹھا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا سرائے کے باہر گاڑی تک پہونچا۔

گاڑی بان اپنے سر کے نیچے ہاتھ رکھے ہوئے سو رہا تھا۔ اس حالت میں دیکھ کر افضل بیگ کو ترس آگیا اور بغیر کچھ کہے سنے اپنی جگہ واپس لوٹ آیا۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ اُس کے والد جاگ رہے ہیں اُس نے اپنا بستر گاڑی بان کو دینے کے لئے لپیٹا۔ بستر اٹھا کر دو ہی قدم چلنے پایا تھا کہ ایک آواز آئی۔

" افضل !"

وہ کانپ گیا۔

یہ آواز اُس کے والد کی تھی .... وہ اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گیا۔

میں نے تمھیں کیا اسی دن کے لیئے پالا تھا۔ تم جو چال چلنا چاہتے ہو اس میں تم کامیاب نہ ہو سکو گے۔ میں نے زمانہ دیکھا ہے۔ آخر تمھارا باپ ہوں۔

وہ بُت کی طرح خاموش کھڑا سنتا رہا۔

" اِدھر آؤ۔"

افضل بیگ کی حالت بید کی مانند تھی۔ حالانکہ اُس کے دل میں کوئی ایسی بات نہ تھی کہ جس کو چال یا دھوکا کہا جائے۔ وہ صرف ایک انسان کے ساتھ ہمدردی کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اُس کا یہ سوچا پورا نہ ہو سکا .... والد کے حکم پر واپس آیا اور گردن جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

افضل بیگ کے والد کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ ان کی آنکھیں مشعل

کی طرح چمک رہی تھیں۔ افضل بیگ کو اپنے قریب کھڑا دیکھ کر گرجدار آواز میں بولے۔

برخوردار کہاں جا رہے تھے ؟

جی !

کیا کچھ کم سننے لگے ہو ؟

جی نہیں

تو پھر میں جو پوچھ رہا ہوں اُس کا جواب دو۔

ابا جان ! .... میں اپنا بستر گاڑی بان کو دینے کے لئے لے جا رہا تھا۔

کیوں ؟

اُس کے پاس بستر نہیں ہے۔

تمہارے پاس کیا دوسرا بستر موجود ہے جس کو تم بچھاؤ گے۔ مجھے تمہاری بات کا بالکل یقین نہیں۔ اس سے پہلے تم کہاں گئے تھے ؟

گاڑی بان کو دیکھنے کے لئے۔

کیا کہیں اور جگہ جانے کا ارادہ تھا .... جا سکتے ہو۔

ابا جان آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔

اتنا سنتے ہی افضل بیگ کے والد آپے سے باہر ہو گئے، فوراً اٹھا افضل بیگ کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا۔ لیکن سعادت مند بیٹے کے ماتھے پر شکن تک نہ آئی۔

جاتا کیوں نہیں ۔۔۔۔۔۔ دُور ہو یہاں سے ۔ میں تیری شکل دیکھنا گوارا نہیں کرتا ۔۔۔۔۔۔ زندگی میں آج پہلی بار یہ واقعہ ہے کہ مجھے "غلط فہمی" کہا۔

ابا جان معاف کر دیجئے۔

معافی کیسی ۔۔۔۔۔۔۔۔ بابا۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ قطعی غلط ہے۔ معافی تو مجھے مانگنی چاہیئے۔

افضل بیگ خاموش کھڑا سنتا رہا۔

خاموشی نیم رضا۔ تمھارا مطلب یہ ہے کہ میں واقعی مجرم ہوں۔

افضل بیگ سخت پریشان تھا کہ والدی ان باتوں کا کیا جواب دے شاید کوئی بات منہ سے ایسی نکل جائے کہ جس کو میں نا مناسب سمجھوں اور یہ غلط سمجھ جائیں۔ جب کسی صورت سے معافی ملتی نظر نہ آئی تو بستر اپنی چارپائی پر رکھ کر باپ کے قدموں میں گر پڑا۔

ابا جان خدا کے لئے معاف کر دیجئے۔ میری کیا مجال کہ آپ کی شان میں ایسا خیال کروں۔ میں کیا چیز ہوں ——— یہ سب آپ ہی کی بدولت ہے۔

اسی لئے تو یہ انعام دے کر جا رہے تھے۔

بالکل نہیں ابا جان ——— میں کیسے یقین دلاؤں۔

ضرورت ہی کیا ہے؟

آپ کے یقین دلانے کو ——— خدا کے لئے کچھ شبہ نہ کیجئے۔

ایک گھنٹہ اسی طرح سوال وجواب میں گزر گیا، اور بڑی مشکل سے افضل بیگ کے والد کا غصّہ ٹھنڈا ہوا۔ افضل بیگ بغیر بستر بچھائے چارپائی پر لیٹ گیا۔ بیچارہ تبادلہ کی وجہ سے پہلے ہی کافی مغموم تھا، اس نئی افتاد نے اور بھی رنجیدہ کر دیا۔ گھنٹوں چارپائی پر کروٹیں بدلتا رہا۔ نہ معلوم کب نیند آئی۔

سرائے میں مقیم دوسرے مسافر بہ تمام گفتگو سن رہے تھے۔ کوئی کچھ سمجھا اور کوئی کچھ۔ ان ہی لوگوں میں ڈاکوؤں کا ایک گروہ بھی دس آدمیوں کا تھا۔ جب سب مسافر سو گئے تو ڈاکوؤں میں کچھ مشورہ ہوا اور ایک ایک کر کے سب سرائے سے باہر آ گئے۔ بیل گاڑی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ان میں سے ایک نے گاڑی بان کا ہاتھ ہلا کر اس کو جگایا۔ گاڑی بان آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔ چاروں طرف آدمیوں کو دیکھ کر تاڑ گیا کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ لیکن پھر بھی بھولا بن کر پوچھا۔

فرمایئے، کیا بات ہے؟

گروہ میں سے ایک نے گاڑی بان کی گدی پکڑ کر دھکا دیتے ہوئے کرخت لہجے میں کہا۔

اگر جان بچانا چاہتا ہے تو جلدی بیلوں کو گاڑی میں جوڑ اور جہاں ہم لے جانا چاہیں خاموشی سے چل۔ ورنہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو لے۔

مجبوراً کہنا پڑا

بہت بہتر ہے۔

گاڑی بان کے یہ الفاظ سن کر سب نے قہقہہ لگایا۔ کسی نے ان میں سے

بھی کہا۔

ہو گیا سیدھا۔

ایک اور بولا

ارے بھئی یہ انسان ہے۔ جان تو چیونٹی کو بھی پیاری ہوتی ہے۔

وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی بیلوں کو گاڑی میں جوڑا اور وہ دس آدمی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے جو گاڑی بان کے بالکل نزدیک بیٹھا ہوا تھا لاٹھی سے ایک سمت کو چلنے کیلئے اشارہ کیا۔ اس کی کیا مجال تھی کہ وہ ذرا بھی خلاف چلتا۔ اشارہ کی طرف کو گاڑی موڑ دی۔ چاندنی رات میں بیل بھی لمبے لمبے قدم اٹھا تے چلے جا رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں گاڑی کہیں کی کہیں پہنچ گئی۔ چلتے چلتے ان کو ایک آبادی دکھائی دی۔ ان لوگوں میں سے کوئی کہتا تھا کہ یہ وہی جگہ ہے، کوئی انکار کرتا تھا، یہ باتیں اشاروں میں ہو رہی تھیں۔ اسی وجہ سے گاڑی بان کچھ سمجھ نہ سکا۔ گاڑی یہاں ٹھہرائی گئی۔

اس آبادی میں ڈاکوؤں نے ڈاکہ ڈالنے کا پروگرام بنا رکھا تھا، کسی مخبر نے بھی اس کی اطلاع پولیس کو دیدی تھی۔ پولیس کا ایک دستہ پہلے ہی سے تعینات کر دیا گیا تھا ــــــ کچھ دیر تک یہ لوگ باہم الجھتے رہے۔ آخر کار گاڑی سے نیچے اُتر پڑے۔ گاڑی بان کو حکم دیا کہ خبردار جب تک ہم واپس نہ آئیں کہیں نہ جانے۔ گاڑی بان نہ کرتا تو کیا کرتا۔ تھوڑی دور چلنے پائے تھے کہ گولیاں چلنے کی آوازیں آئیں ــــ

ڈاکو فرار ہو گئے ——— گاڑی بان زمین پر پڑا ہوا تڑپ رہا تھا۔ گولی گاڑی بان کے منہ پر لگی تھی ——— پولیس کے سپاہی گاڑی کی طرف دوڑے۔ لیکن گاڑی تک پہنچنے سے پہلے ہی غریب گاڑی بان نے دم توڑ دیا۔ بیل گاڑی اور لاش کو پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ لیکن ڈاکوؤں میں سے ایک بھی گرفتار نہ ہو سکا۔ پولیس مخبر کے ذریعے راتوں رات گاڑی اور لاش کو اسی شہر میں پہونچ گئی۔ سُراغ لگانے سے معلوم ہوا کہ یہ گاڑی سرائے سے چلی تھی۔ بس پھر کیا تھا علی الصباح افضل بیگ اور اس کے والد دونوں گرفتار کر لئے گئے۔ پولیس نے ان دونوں کو ڈاکوؤں کا مددگار قرار دیا۔

افضل بیگ اور اس کے والد اس ناگہانی آفت و مصیبت پر سخت حیران بھی تھے اور ملول بھی۔ افضل بیگ کے خیال میں اس کا سبب اس کے والد کا غرور تھا، دوسری طرف اُس کے والد کے خیال میں یہ جو کچھ ہوا افضل بیگ کی وجہ سے۔ وہ رات کو اپنا بستر اٹھا کر گاڑی بان کے پاس کیوں جا رہا تھا۔ وہ اس ذلت پر غصّہ کے مارے آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ کبھی دل ہی دل میں کہتے کتنا اچھا ہوتا کہ یہ میرے گھر پیدا نہ ہوتا، یا بچپن ہی میں مر جاتا۔ اب کس منہ سے گھر واپس جاؤں گا۔ خدایا میری موت بھیج دے،

لیکن انسان کا سوچا کب پورا ہوتا ہے، اور ایسے لوگوں سے تو خود قدرت بھی نفرت کرتی ہے جو مخلوق سے ہمدردی نہیں کرتے۔ نوکر کا کر

ہوشیار ہو جاتا ہے مگر وہ اس حالت میں بھی افضل بیگ کو ڈانٹ رہے تھے
اور جو کچھ اُن کو نہ کہنا چاہیئے تھا وہ بھی کہہ گئے۔ افضل بیگ آخر اسی باپ
کا بیٹا تھا۔ رہ رہ کر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ اگر باپ بیٹے کا رشتہ حائل نہ
ہوتا تو وہ حوالات میں بند رہتے ہوئے بھی ان کو چھٹی کا کھایا یاد دلا دیتا۔
مگر سانس پر سانس بھر کر رہ جاتا تھا۔ مفرور ڈاکوؤں کا پتہ لگانے اور ان کے
متعلق تفتیش کے سلسلے میں پولیس نے اُن کو سخت سے سخت ایذائیں پہنچائیں۔
اور ریمانڈ پر ریمانڈ لئے مگر کامیابی نہ ہوئی۔

کافی عرصہ گزر جانے کے بعد گاڑی نہ پہنچنے پر زمیندار صاحب کو تشویش
ہوئی۔ وہ بھی حالات معلوم کرنے کے لئے اسی شہر میں آ پہنچے۔ بڑے ڈاکخانہ
پہونچ کر افضل بیگ کے متعلق معلومات کیں تو وہاں سے کورا جواب ملا۔
اس سے اُن کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ———— راستہ بڑا ہی
خطرناک ہے۔ ڈاکوؤں نے ضرور لوٹ مار کی ہوگی۔ اگر یہ نہیں تو وہ اب تک
کیوں نہیں پہونچے ———— میں بھی اسی راستے سے آیا ہوں ————
یقیناً کوئی حادثہ پیش آیا ہے ———— اب کہاں جاؤں، کس سے معلوم
کروں۔ اسی طرح شام ہو گئی۔ مایوس ہو کر سرائے کا رُخ کیا۔ اتفاق سے
وہی کوٹھری خالی تھی جس میں افضل بیگ اور اس کے والد نے قیام کیا تھا۔
پولیس نے بیچارے بھٹیارے کو بھی حراست میں لے رکھا تھا کہ اس کے یہاں
ڈاکو ٹھہرتے ہیں۔ شاید کچھ اسی سے پتہ چلے گر بھٹیاری اپنے چھوٹے چھوٹے
بچوں کے ساتھ دن رات آنسو بہانے میں مشغول تھی۔ زمیندار صاحب تمام

دن کی بھاگ دوڑ اور پریشانی سے تھک کر چور چور ہو گئے تھے۔ فکرات کے ہجوم نے نیند اور بھوک کافور کر دی تھیں۔ چارپائی پر بغیر بستر بچھائے لیٹ گئے۔ کچھ دیر گزرنے پر اُن کو بھٹیاری کے مکان سے بچوں کے رونے کی آواز سنائی دیں۔ زمیندار صاحب نے خیال کیا کہ بھٹیاری بہت غریب معلوم ہوتی ہے۔ اس کے گھر میں اندھیرا بھی ہے۔ بچے بھوک مارے روتے ہوں گے۔ یا کسی شرارت پر بھٹیاری نے مارا ہوگا۔ لیکن جب بھٹیاری کے رونے کی آواز آئی تو اُن کا دل بھر آیا۔ کچھ دیر ضبط بھی کیا۔ جب ضبط نہ کر سکے تو چارپائی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور اس کے دروازے پر پہنچکر دستک دی۔

کھٹ کھٹ کی آواز سن کر بھٹیاری سمجھی کہ پھر کوئی سپاہی آیا ہوگا۔ روتی ہوئی دروازے پر آئی تو سپاہی کی بجائے زمیندار صاحب کو جو کہ ایک مسافر کے روپ میں تھے دیکھ کر آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔

کیا حکم ہے؟

میں کوئی حاکم نہیں بلکہ ایک مسافر ہوں۔ تمھارے بچوں کے اور تمھارے رونے کی آواز سن کر رونے کا سبب دریافت کرنا چاہتا ہوں۔

مسافر صاحب نہ ہی معلوم کریں تو بہتر ہے۔

ہو سکتا ہے میں کچھ مدد کر سکوں۔

بگڑی قسمت کو کیا آپ بنا دیں گے۔ مسافر صاحب آرام کریں۔ ہمارا دکھ سن کر پریشان ہوں گے۔

یہ تو انسان کے بس سے باہر ہے۔ بنانا بگاڑنا قدرت کا کام ہے۔ پھر بھی

تو کچھ نہ کچھ بتانا چاہیئے۔

آپ مسافر ہیں، پردیسی ہیں۔

اس سے کیا مطلب؟

یہی کہ۔۔۔۔۔۔!

اور پھر وہ خاموش ہوگئی۔

زمیندار صاحب نے پاؤں بدلتے ہوئے،

خاموش کیوں ہوگئیں؟ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔۔۔ڈرو نہیں۔

زمیندار صاحب کی گفتگو کا لہجہ کچھ ایسا ہمدردانہ تھا کہ بھٹیاری کو یقین ہوگیا کہ یہ مسافر خدا ترس ہے، ضرور کچھ مدد کرے گا۔ اسی لئے اُس نے شروع سے آخر تک سارا قصہ سنا ڈالا۔ زمیندار صاحب نے بھی خاموشی سے سارا ماجرا سنا۔ جب بھٹیاری خاموش ہوگئی تو دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بھٹیاری نے نیچی نگاہیں کرلیں، اور انتظار کرنے لگی کہ شاید کوئی تسلی بخش جواب ملے۔ یہاں زمیندار صاحب کو اپنی پڑگئی، کہ بیل گاڑی ان کی اپنی تھی، گاڑی بان جو پولیس کی گولی سے ہلاک ہوچکا تھا ان کا بڑا ہی وفادار نوکر تھا۔ وہ دو آدمی جو سرائے سے گرفتار کئے گئے سوائے سمدھی اور داماد کے اور کون ہوسکتے ہیں۔ اس خیال کے ساتھ ہی ان کا سر چکرا گیا، اور آنکھوں کے آگے اندھیرا آگیا۔ بھٹیاری کا خیال تھا کہ میاں مسافر اس کے لئے کچھ سوچ رہے۔ مگر ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

بھٹیاری کچھ دیر انتظار کر کے واپس جانے لگی۔ زمیندار صاحب نے فوراً جیب میں ہاتھ ڈال کر چاندی کے دس روپے نکالے اور بھٹیاری کو آواز دیتے ہوئے،

لو بٹیا۔

بھٹیاری نے پلٹ کر دیکھا، اور زمیندار صاحب کے قریب آکر بولی، مسافر صاحب! آپ بڑے خدا ترس معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کو خدا خوش رکھے۔ مجھے رقم کی ضرورت نہیں۔ میں صرف اپنے خاوند کی رہائی چاہتی ہوں اگر آپ اس بارے میں میری مدد کر سکتے ہیں تو کر دیجئے۔ یہ چھوٹے چھوٹے بچے جو اپنے باپ کی یاد میں بلک بلک کر رو رہے ہیں دعا دیں گے۔

میں مجبور ہوں، ان کاموں کے لئے وقت کی بہت ضرورت ہے میرے پاس اتنا وقت نہیں۔ کل صبح مجھے یہاں سے واپس جانا ہے۔ یہ دس روپے لے لو۔ شاید کچھ کام آجائیں۔

زمیندار صاحب چونکہ کہہ چکے تھے کہ شاید مدد کر سکوں۔ اپنی بات کو نبھانے کی غرض سے بطور امداد یہ دس روپے دئے۔ اگرچہ بھٹیاری اپنی مصیبت میں اس امداد کو امداد نہیں سمجھتی تھی، لیکن زمیندار صاحب کے اصرار پر روپے لینے پڑے۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ زمیندار صاحب واپس آکر اپنی چارپائی پر آکر لیٹ گئے۔ اس پریشانی میں بھلا نیند کہاں آتی۔ طرح طرح کے خیال آرہے تھے۔ اس خیال نے تو اور بھی خوفزدہ کر دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو پولیس شبہ

میں مجھے بھی گرفتار کرلے۔ ایسی حالت میں وہ اپنے ہونے والے داماد اور سمدھی کی مدد کیسے کرسکتے تھے۔ ایک شریف آدمی کے لئے پولیس کی دھمکی ہی کافی ہوتی ہے، اور یہاں تو ڈکیتی کا الزام تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ بدمعاش کا حمایتی بھی بدمعاش سمجھا جاتا ہے۔ تمام رات وہ اسی قسم کی باتیں سوچتے رہے۔

بڑی مشکل سے رات کٹی اور صبح ہوئی۔ زمیندار صاحب نے اپنا سامان بغل میں دبایا اور لمبے لمبے قدم رکھتے ہوئے شہر سے باہر جانے والی سڑک پر چل دیے۔

انگریزوں کو تسلط جمائے ہوئے پانچ سال ہوگئے تھے، لیکن اُس وقت بھی انگریزی فوج اور پولیس کے آدمی بھیڑیوں کی طرح شکار کی تلاش میں سڑکوں اور پگڈنڈیوں پر پھرا کرتے تھے۔ ایک گشتی دستہ بھی اُسی راہ سے گزر رہا تھا، سپاہیوں کی نگاہ زمیندار صاحب پر پڑی، اس دستہ کا جو انچارج تھا اس نے زمیندار صاحب کو دیکھا تو زمیندار صاحب کے ہوش اُڑ گئے۔ زمیندار صاحب گھبراہٹ میں راستہ کاٹ کر جانے لگے تو انچارج کو ان کی اس گھبراہٹ پر شبہ ہوگیا، اس نے اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا، اُنھوں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی، پھر ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر راستہ روک کر سخت آواز میں کہا،

خبردار آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا۔

تمام سپاہی سامنے آکر کھڑے ہوگئے، انھوں نے اپنی سنگینوں کو سنبھال لیا۔ زمیندار صاحب کا دل دھڑکنے لگا، زندگی کی آس چھوڑ دی کہ ان ظالموں سے بچنا بہت مشکل ہے۔ کوئی دم میں سنگین کلیجے سے پار ہونے والی ہے۔ سانس لینے میں دشواری ہوتی جارہی تھی، کہ انچارج نے ٹھوکر لگاتے ہوئے پوچھا۔

کون ہو تم ؟

میں ایک مسافر ہوں ۔

یہ تو ہم بھی جانتے ہیں ۔ ہمارے بھی آنکھیں ہیں ۔ رسّی جل گئی مگر بل باقی ہیں ۔ وہ زمانہ ختم ہوا جب تم لوگوں نے من مانی کی ۔ اب صاحب بہادر کی حکومت ہے ۔

اتنا کہہ کر انچارج خاموش ہو گیا ، اور زمیندار صاحب کے جواب کا انتظار کرنے لگا ۔

لیکن زمیندار صاحب کچھ نہ بول سکے ۔ اُن کی بڑی بڑی مونچھیں جو ہر وقت چڑھی رہا کرتی تھیں ، اور جن پر خود اُن کو بھی ناز تھا اس وقت اُن کی شان اور جان کے لئے وبال بن رہی تھیں ۔ انچارج نے اپنا ہاتھ بڑھا کر مونچھوں کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا ۔

کونسے گروہ سے تعلق رکھتے ہو ؟

کیسا گروہ ؟

بڑے بھولے ہو ۔ گروہ نہیں جانتے ؟

جی نہیں ۔

معلوم ہو جائے گا ، ..... انچارج نے گرفتاری کا حکم دیتے ہوئے اشارہ کیا ۔

حکم کی دیر تھی ، ہاتھوں میں فوراً ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں ، اور شہر کی طرف واپس چل پڑے ۔ زمیندار صاحب نے کافی منت وسماجت کی مگر انھوں نے

ایک نہ سنی۔ اور اسی حالت میں شہر کی طرف چلنا پڑا۔ تمام راستے یہی خیال رہا کہ ایسا نہ ہو یہاں وہ دونوں باپ بیٹے بن رہیں مجھے بھی اُسی جگہ لیجایا جائے۔ وہ یقیناً مجھے دیکھتے ہی کہدیں گے کہ گاڑی اس کی ہے۔ پھر تو تمام الزامات میرے سر پر آپڑیں گے۔ دل ہی دل میں دعا مانگتے چلے گئے کہ اے خدا تو بڑی قدرت والا ہے۔ پل بھر میں کچھ کا کچھ کر دیتا ہے۔ تیرے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں۔ میری آبرو تیرے ہاتھ ہے۔ نہ معلوم کس گناہ کی سزا دی جارہی ہے۔ وہ اسی دُھن میں شہر پہونچ گئے بسپاہی زمیندار صاحب کو سیدھے کوتوالی لے کر پہونچے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ جس بات کا کھٹکا ہوتا ہے وہ درپیش آتا ہے۔ زمیندار صاحب جس بات سے ڈر رہے تھے وہی پیش آئی۔ انھوں نے دور سے دیکھا کہ افضل بیگ اور اُس کے والد حوالات کی کھڑکی سے جھانک رہے۔ یہ دیکھکر زمیندار صاحب کا چہرہ فق ہو گیا اور ہاتھ پاؤں پھُول گئے۔

سپاہی زمیندار صاحب کو لے کر تھانہ دار کے سامنے پہونچے، تھانہ دار نے سپاہیوں سے کچھ سوالات کر کے کوتوال کے روبرو لے جانے کے لئے حکم دیا۔ تعمیلِ حکم کے لئے ان سب کو کوتوال کے دفتر میں جانا پڑا۔ کوتوال ان لوگوں کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھ ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا، اور لگا مونچھوں پرتاؤ دینے۔ حوالدار صاحب جو انچارج تھے سلوٹ مار کر قریب ہی کھڑے ہو گئے، کوتوال صاحب نے زمیندار صاحب کے چہرے پر قہر آلود نظر ڈال کر سپاہیوں سے پوچھا۔

کیا یہ بھی اُنہی لوگوں سے تعلق رکھتا ہے ؟

ابھی تک ہم نے کچھ نہیں پوچھا جنگل میں آوارہ گردی کرتے ہوئے گرفتار کیا ہے۔ سپاہیوں نے جواب دیا۔

اس پر کوتوال نے حوالدار کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

اس کو علیحدہ بند کیا جائے، اور دوسرے سے اُن لوگوں سے اس کے بارے میں معلوم کرو۔

حوالدار نے ایسا ہی کیا۔ زمیندار صاحب کو ایک فرلانگ کے فاصلے پر کھڑا کر کے حوالات کے دروازے پر پہنچکر بھٹیارے سے پوچھا۔

تم اُس شخص کو جانتے ہو جو ہتھکڑی پہنے کھڑا ہے۔

جی نہیں۔

اور پھر افضل بیگ کو دروازے پر بلا کر پوچھا۔

اس ملزم کے بارے میں تم کچھ جانتے ہو ؟

جی ہاں --- یہ ہمارے گاؤں کے رئیس ہیں۔ وہ بیل گاڑی جو پولیس کے قبضے میں ہے اُنہی کی ہے۔

حوالدار نے افضل بیگ کو واپس بھیج دیا، اور اشارہ سے افضل بیگ کے والد کو بلا کر ان سے بھی وہی سوال کیا۔ انھوں نے بھی وہی جواب دیا جو افضل بیگ نے دیا تھا۔

اس کے بعد حوالدار زمیندار صاحب کے پاس پہنچا، اور پوچھا۔

کیا تم ان حوالاتیوں کو جانتے ہو۔ اور دیکھو وہ بیل اور گاڑی جانتے ہو

کس کی ہے !

زمیندار صاحب سخت پریشان کہ کیا جواب دوں ۔ اقرار کرتا ہوں تب مصیبت اگر انکار کرتا ہوں تب بھی وہی بات ہے ۔ کیوں کہ اُنھوں نے حوالدار کو فضل بیگ اور اُس کے والد کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا ۔ نہ معلوم انھوں نے کیا کہا ہوگا ۔ کون کس کی مصیبت اپنے سر لیتا ہے ۔ ——— یہی کہا ہوگا کہ میں گاڑی کا مالک ہوں ——— یہ سوچ کر لمبی سانس لے کر آہ بھرتے ہوئے بولے ۔

جی ہاں ، خوب اچھی طرح جانتا ہوں ۔

کیا جانتے ہو !

وہ دونوں آدمی میرے گاؤں کے ہیں ۔ اور بیل گاڑی بدقسمتی سے میری ہی ہے ۔

حوالدار یہ جواب سنکر مسکرانے لگا ۔

زمیندار صاحب اس مسکراہٹ سے گھبرائے ، اور پھر سوچنے لگا کہ جو کچھ پڑے گی برداشت کرنا ہوگا ۔ ان کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو حوالدار دیکھ رہا تھا ، اپنے ہاتھ کی چھڑی کو گھماتے ہوئے بولا ۔

خاموش ہو گئے ؟

جی میں اتنا ہی جانتا ہوں ۔

غلط بالکل غلط ——— ابھی بہت کچھ جانتے ہو ۔

میں نے جو کچھ کہا ہے درست ہے ۔ آپ کو یقین کرنا چاہیئے ۔

تم جو کچھ کہہ چکے ہو اُس پر یقین ہے مگر تمہارا یہ کہنا کہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا غلط ہے۔ ہمیں مجبور نہ کرو کہ تم سے سختی سے پوچھا جائے۔

میرے بیان کے علاوہ آپ جو کچھ پوچھنا چاہیں پوچھ سکتے ہیں۔

یہ گاڑی یہاں کیسے آئی؟

افضل بیگ جو اس وقت حوالات میں ہے محکمہ ڈاک میں ملازم ہے، اس کا اس شہر کے لئے تبادلہ ہو گیا تھا۔ سواری کے لئے میں نے اپنی گاڑی دے دی تھی۔ کئی روز تک گاڑی واپس نہ گئی تو مجھے تشویش ہوئی۔ وجہ معلوم کرنے کے لئے شہر آیا۔ تمام دن کوشش کرنے کے بعد بھی کچھ پتہ نہ چلا محکمۂ ڈاک میں گیا مگر وہاں بھی سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ شام ہو چکی تھی تھک کر بدن چور چور ہو گیا مجبوراً سرائے کا رُخ کیا۔ رات کو بھٹیاری اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچوں کے رونے کی آواز نے دل بے چین کر دیا۔ میں وجہ معلوم کرنے کے لئے اس کے دروازے پر گیا، آواز دی۔ بھٹیاری آئی اُس سے رونے کا سبب پوچھا۔ وہ انکار کر کے جانے لگی تو میں نے اصرار کیا۔ بڑی کوشش کے بعد بھٹیاری نے سب ماجرا سنایا۔ سارا قصہ سن کر میں سمجھ گیا کہ وہ گاڑی میری ہے۔ گاڑی بان قتل ہو چکا ہے۔ افضل بیگ اور اُس کے والد حوالات میں ہیں۔ اب میرے لئے یہاں ٹھہرنا بے کار تھا۔ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ کچھ دور چلا تھا کہ پولیس کا دستہ ملا، اس نے گرفتار کر لیا۔ اب آپ کے سامنے موجود ہوں۔

اتنا کہہ کر زمیندار صاحب خاموش ہو گئے تو حوالدار نے پھر سوال کیا،

اپنی گاڑی اور بیل لینے کے لئے کبھی یہاں تک آنا گوارا نہ کیا۔
مجھے ضرور آنا چاہیئے تھا۔ مگر چونکہ ڈکیتی کے کیس میں یہ چیزیں آپ کے قبضہ میں آئی ہیں۔ مالک ہونے کی وجہ سے مجھ سے چھان بین ہونا ضروری تھا۔ اس کے لئے آپ کے روبہ کے خوف سے نہ آنا مناسب سمجھا۔
لیکن قدرت نے یہاں بھیج ہی دیا۔
انسان کیا کرسکتا ہے۔ اگر آپ میری مدد کرسکتے ہیں تو کریں۔ خدا تمھاری مدد کرے گا۔
ہم تو کریں، مگر صاحب کے حکم سے مجبور ہیں۔ پھر جو کچھ مدد کرسکتے ہیں اس کے لئے تیار ہیں۔
یہ کہہ کر حوالدار چلا گیا، اور کچھ دیر کے بعد کوتوال کے ساتھ واپس آیا۔ زمیندار صاحب نے دیکھا کہ کوتوال کے ماتھے پر بل پڑے ہوئے ہیں۔ حوالدار کچھ کہہ رہا ہے، مگر وہ سوائے گردن ہلانے کے کچھ نہیں کرتا۔ تاڑ گئے کہ کوتوال بدگمان ہے۔ رہائی مشکل ہے۔ اب انھوں نے خیال کیا یہ بزدلی بے سود ہے، مجھے افضل بیگ اور اس کے والد کی مدد کرنی چاہیئے۔ ابھی یہ اس خیال ہی میں تھے کہ کوتوال اور حوالدار بھی قریب آگئے۔ کوتوال کے حکم دینے پر حوالدار نے انھیں دوسری کوٹھری میں بند کردیا۔
اسی کش مکش میں آدھا دن گزر گیا۔ پولیس نے زمیندار صاحب کا بیان قلم بند کیا۔ انھوں نے اپنا بیان صاف دیا۔ لیکن پولیس والوں نے حسب دستور فرعونیت دکھائی۔ زمیندار صاحب بھی دل سخت کرچکے تھے، بے دھڑک کہہ دیا

سنئے جناب! میں ڈاکوؤں کا سردار ہوں۔ جن لوگوں کو آپ نے بلا وجہ اپنی حراست میں لے رکھا ہے وہ بالکل بے قصور ہیں۔

انچارج نے اتنا سننے پر دوسرے ڈاکوؤں کے بارے میں دریافت کیا زمیندار صاحب نے بڑی لاپرواہی سے جواب دیا۔

وہ فرار ہو گئے ـــ جس طرح میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا۔

کہاں ملیں گے وہ؟

میں کچھ نہیں بتا سکتا۔

سیدھی انگلیوں گھی نکلنا ناممکن ہے۔

بے شک

بیان ختم ہو گیا۔ انچارج نے کوتوال کے کہنے پر بھٹیارے، افضل بیگ اور اُس کے والد کو رہا کر دیا۔ رہائی کے بعد یہ تینوں ایسے بھاگے کہ مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ ان کا فرض تھا کہ زمیندار صاحب کے بارے میں کوشش کرتے۔ مگر ہر شخص کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔ خیال کیا کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی نئی مصیبت گلے نہ پڑ جائے۔ افضل بیگ نے یہاں سے چھٹکارا پاتے ہی اپنے محکمے میں حاضری دی۔ بھٹیارہ سیدھا اپنی سرائے پہنچا۔ افضل بیگ کے والد نے تو یہاں ذرا سی دیر قیام کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ ایک رتھ کرائے پر لیا اور گاؤں کو روانہ ہو گئے۔

ان تینوں کو زمیندار صاحب کا ذرا بھی خیال نہ آیا کہ اُن پر کیا بیت

رہی ہوگی ۔ حالانکہ بھٹیارے کو گھر پہ آکر معلوم بھی ہو گیا تھا کہ ایسی وضع قطع کا کوئی شخص دس روپے میرے بچوں کے لئے دے گیا تھا ـــــــ مگر بہت سے انسان ناشکرے ہوتے ہیں ۔ افضل بیگ کے والد کو اپنے گاؤں پہنچ کر اتنا بھی خیال نہ آیا کہ زمیندار صاحب کے مکان پر اس حادثے کی اطلاع کر دیتے ۔ جب ان دونوں سمجھدار اور معمر لوگوں نے احسان فراموشی کی، افضل بیگ تو پھر بھی ایک ناتجربہ کار بچہ ہی تھا۔ بھلا وہ کیا کر سکتا تھا ۔

زمیندار صاحب کو پولیس کے مصائب برداشت کرتے کئی دن گزر گئے۔ اُن پر جو کچھ بیتی اس کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کیا۔ بیکسی کا یہ عالم کہ کوئی بھی اپنا ہمدرد نہ دکھائی دیتا تھا۔ مگر کہاوت مشہور ہے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے ۔

ایک روز صبح کے وقت کوتوالی میں غل مچا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بہت بھاری جلوس چلا آرہا ہے ۔ سینکڑوں آدمی لاٹھیاں کاندھے پر رکھے چلے آرہے تھے ۔ انھوں نے کچھ آدمیوں کو رسیوں سے باندھ رکھا تھا۔ اس شور و غل پر کوتوالی میں تعینات سپاہی چوکنا ہو گئے ۔ جو لوگ حوالات میں بند تھے سمجھے کہ نہ معلوم کتنے بے گناہ گرفتار ہو کر آئے ہیں ۔ کافی دیر تک یہ ہنگامہ برپا رہا ۔ بالآخر کوتوال صاحب کے حکم سے بندھے ہوئے لوگوں کو حوالات میں بند کر دیا گیا ۔

کون تھے وہ لوگ ـــــــ وہی ڈاکو، جو سرائے سے گاڑی لے گئے تھے، اور جن کی وجہ سے بیچارے زمیندار صاحب حوالات کی

ہوا کھا رہے تھے۔ تقریباً ایک ہفتہ کے بعد اُن ڈاکوؤں نے پھر اُسی گاؤں پر ڈاکہ ڈالا جہاں گاڑی بان پولیس کی گولی کا نشانہ بنا تھا۔ جس وقت ڈاکہ ڈالا جا رہا تھا، ٹھیک اسی وقت کچھ گاؤں والوں کی آنکھ کھل گئی، انھوں نے کچھ اور لوگوں کو خبر کرکے بہت ہوشیاری سے گھیرا ڈال دیا، اس کام میں اتنی پھرتی کی کہ ڈاکوؤں کو بالکل خبر نہ ہوئی۔ جب گاؤں والوں کو پورا اطمینان ہو گیا کہ اب ڈاکو کسی صورت سے بھی فرار نہ ہو سکیں گے تو مقابلہ شروع ہوا، دونوں پارٹیوں میں خوب ڈٹ کر زور آزمائی ہوئی۔ لیکن ڈاکوؤں کی تعداد گاؤں والوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی، مجبوراً ہار مان لی، اور سب کے سب گرفتار کر لئے گئے۔ پہلے تو گاؤں والوں نے مار پیٹ کرکے اپنے دل کی نکالی بعد میں کوتوالی دکھائی۔

اب پولیس کی توجہ زمیندار صاحب سے ہٹ کر ان نئے مہمانوں کی طرف مبذول ہو گئی، اور جو کچھ خاطر مدارات ہو سکتی تھی وہ پوری پوری طرح کی گئی۔ جہاں ڈاکوؤں نے دوسرے واقعات کا اقرار کیا وہ بیل گاڑی والا واقعہ بھی سُنا دیا۔ اور اس طرح زمیندار صاحب بے قصور ثابت ہو گئے۔ کوتوال نے ان کو دفتر میں بلا کر اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور بڑی عزت کے ساتھ ان کو رخصت کیا۔ ان کی بیل گاڑی بھی دیدی گئی۔ بلکہ ایک تحریر بھی دی تاکہ راستہ میں پھر سرکاری آدمی ان کو پریشان نہ کریں۔

زمیندار صاحب کوتوالی سے رخصت ہو کر پہلے سرائے میں پہونچے — بھٹیاری اور اس کے بچے اُن کو دیکھتے ہی قدموں میں آ پڑے۔ بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ زمیندار صاحب نے ان کی خیریت معلوم کرنے کے بعد روانگی کا

ارادہ کیا تو بھٹیاری نے بڑی منت وسماجت سے ان کو ٹھہرایا اور جو کچھ میسر آیا اُن کے سامنے لاکر رکھدیا۔ زمیندار صاحب بھٹیاری کی اس خاطر و مدارات سے بہت خوش ہوئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر اپنے گاؤں کو روانہ ہو گئے۔

زمیندار صاحب کو افضل بیگ کا پتہ معلوم تھا۔ لیکن ان لوگوں کی خود غرضی سے ان کو بہت صدمہ پہنچا تھا۔ اس لئے وہ افضل بیگ کے پاس نہ پہنچے۔

دوسرا باب

افضل بیگ کے والد جس وقت اپنے گھر پہنچے تو زمیندار صاحب کے گھر والوں کو سخت تشویش ہوئی۔ فوراً انھوں نے اپنا نوکر ان کے پاس خیریت معلوم کرنے کے لئے بھیجا۔ مگر افضل بیگ کے والد نے اس کو ایسی بے رخی سے جواب دیا کہ اس کو کچھ شبہ ہو گیا۔ دوسری طرف گاڑی اور گاڑی بان کے بھی نہ پہنچنے کی فکر۔ یہ راز سمجھ میں نہ آیا۔ بلکہ پریشانی اور بھی بڑھ گئی۔— زمیندار صاحب کے بیوی بچوں کو افضل بیگ کے والد کے اکھڑے ہوئے جواب پر بہت افسوس ہوا۔ مگر نئی نئی رشتہ داری قائم ہوئی تھی اس لئے اینٹ کا جواب پتھر سے دینا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ ان لوگوں کا ناتہ چھوٹا تھا۔ سماج نے ان کو چھوٹا بنا دیا تھا۔

گھر میں اگر کچھ لوگ افضل بیگ یا اس کے خاندان والوں کو برا کہتے

تو زینب جو زمیندار صاحب کی بڑی لڑکی، اور جس کی منگنی افضل بیگ سے کردی گئی تھی رنج و ناگواری کے خیال سے خاموش رہے۔ حالانکہ ظاہر ہے وہ کنوارے زبان سے کیا بولتی۔ وہ ان لوگوں کے برتاؤ سے دل ہی دل میں گھٹتی رہتی۔ وہ بڑی مشکل میں تھی۔ ایک طرف باپ کی محبت دوسری طرف سسرال کا خیال۔ غرض پھنسی تھی کہ اگر زبان سے اُف بھی کی تو افسانے بن جائیں گے۔ اگرچہ زینب ان باتوں کو سوچ کر خاموش ہی رہی مگر لوگوں کو اس پر بھی چین نہ آیا، اُس کے چہرے ہی کو دیکھ کر قیاس کرنے لگے کہ ہماری باتیں زینب کو ناگوار گزرتی ہیں۔

اُدھر افضل بیگ کے والد نے جو رویہ اختیار کر رکھا تھا اُس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے دل میں یہ بات یقین کی حد تک بیٹھ چکی تھی کہ یہ جو کچھ ہوا صرف زمیندار صاحب کی گاڑی لے جانے کے وجہ سے ہوا۔ کیونکہ زمیندار صاحب ڈاکو ہیں، اُن کا گاڑی بان ڈاکوؤں کے ساتھ ڈاکہ ڈالنے کیوں گیا۔ ابھی تو ابتدا ہے، آئندہ نہ معلوم ان کی وجہ سے اور کیا مصیبتیں اٹھانی پڑیں گی۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ ڈور یہیں توڑ دی جائے تو اچھا ہے۔ انھوں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ تو کر لیا لیکن اس فیصلے میں بالکل غور نہ کیا۔ اُن کا دل و دماغ اب بھی ویسا ہی تھا جیسا کہ [illegible] کے دور میں تھا، حالانکہ انقلاب کے وقت میں کافی ٹھوکریں کھا چکے [illegible] اپنی ناک پر مکھی بھی نہ بیٹھنے دیتے تھے۔ جو کچھ فیصلہ کرتے تھے وہ [illegible] ہوتا تھا۔ کوئی دن ایسا نہ گزرتا تھا جو بیوی بچوں سے جھڑپ نہ ہوتی ہو۔

انھوں نے کئی بار سوچا کہ اس ارادے سے اپنی بیوی کو آگاہ کردو۔ مگر نہ معلوم کیوں خاموش رہے۔ شاید بیوی کی ناراضگی کی وجہ سے۔ کیونکہ وہ بھی زہر کی پڑیا تھیں۔ افضل بیگ کی منگنی خود اس کی والدہ نے اپنی مرضی سے کی تھی۔ اس کو ختم کرنے کا ان کو کیا حق تھا۔ اسی سوچ وچار میں دو روز گزر گئے۔ اس دوران میں انھوں نے گھر میں بھی کسی سے بات چیت نہ کی۔ خاوند کی یہ خاموشی بیوی سے بھی نہ دیکھی گئی۔ موقعہ پاکر پوچھ ہی لیا جس کا انھوں نے کوئی صحیح جواب نہ دیا۔ بیوی کا اطمینان نہ ہوا، اور برابر اصرار کرتی رہیں۔ آخرکار افضل بیگ کے والد مجبور ہوگئے تو انھوں نے تمام رو داد جو ان پر بیتی تھی سنا ہی دی۔ اس کے ساتھ ہی اپنا وہ ارادہ بھی ظاہر کر دیا جس کو بیوی کی ناراضگی کے خوف سے ظاہر نہ کرتے تھے۔ یہ سب باتیں سن کر بیوی کو یقین آگیا۔ کیونکہ ایک طرف تو یہ خود کئی روز غائب رہے اور دوسری طرف زمیندار صاحب بھی غائب۔ نہ گاڑی بان نہ ہی ان کی بیل گاڑی۔

افضل بیگ کی والدہ نے خاوند کو پریشان دیکھتے ہوئے کہا۔

مرزا جی آپ مت گھبرائیے میں سب ٹھیک کرلوں گی۔

وہ کیسے ؟

میں نے کہہ تو دیا، یہ کام اس صفائی سے ہوگا کہ اپنی سب الزام آئے۔

لوگ باگ کیا کہیں گے ؟

کہنے والے کی زبان کون پکڑ سکتا ہے ؟

ہم مغل ہیں۔ اور مغل زبان کا پابند ہوتا ہے۔

ان باتوں کو چھوڑو، ہمیں انھیں باتوں نے یہ دن دکھائے ہیں۔

کہاں ہیں وہ مغل تاجدار؟

بیگم تم نہیں جانتی ہو۔ جب تک ہم زبان اور آن کے پکّے رہے کسی کی نگاہ تک بھی ہم پر نہ اُٹھ سکی، اور جب سے یہ چیز نے چھوڑی تو جو کچھ حالت ہوئی ظاہر ہے۔

تم تو تقریر کرنے لگے۔ ایک طرف چاہتے ہو کہ معاملہ ختم کردیا جائے، دوسری طرف زبان کی پابندی کا بھی خیال ہے۔ آخر کیا کیا جائے۔

میں کیا بتاؤں؟

اچھا تو پھر شادی وہیں ہوگی۔

ارے تم تو ناراض ہوگئیں۔ میرا مطلب سمجھنے کی کوشش کرو۔

سمجھاؤ بھی۔

بس مطلب یہ ہے کہ زمیندار صاحب کا گھرانا ہمارے قابل نہیں۔ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔

اتنا کہہ کر افضل بیگ کے والد خاموش ہوگئے۔

بیوی نے تیوری میں بل ڈالتے ہوئے کہا۔

یہ دورُخی پالیسی نہیں چلے گی۔

تم تو بیوقوف ہو۔

یہ کہہ کر افضل کے والد کھڑے ہوگئے۔ بیوی نے دیکھا کہ اونٹ کسی کروٹ

نہیں بیٹھتا تو وہ بھی جوش میں آکر ایک دم کھڑی ہو گئیں، اور دوڑ کر اپنا برقعہ سنبھالا، افضل کے والد نے بھی مڑ کر دیکھا۔ وہ برقعہ اوڑھ چکی تھیں۔ اب تو اُن کے ہوش غائب ہو گئے۔ ڈرتے ڈرتے آواز دی۔

ارے بیگم کہاں کی تیاری ؟

میں اور بیگم ——— بالکل نہیں ——— دن بھر میں نہ معلوم کتنی بار کیا کیا بناتے ہو۔ آج یہ قصہ ہی ختم کئے دیتی ہوں۔ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری۔

آخر کیا چاہتی ہو ؟

کچھ بھی نہیں۔

پھر یہ کیسی تیاری، کہاں جا رہی ہو ——— میں گھر سے باہر نہ جانے دوں گا۔

مرزا جی نے سوچا تھا کہ میں ذرا آنکھیں دکھاؤں گا تو بیوی ڈر جائے گی لیکن معاملہ برعکس ہوا۔ بیوی کی تیز مزاجی کے آگے مرزا صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہی نہیں پڑا بلکہ مرزا جی کو بیوی کی خوشامد کرنا پڑی۔ اور اصل معاملہ دب کر رہ گیا۔ اچھا ہی ہوا کہ بات ٹل گئی۔ ورنہ مرزا جی کو خطرہ ہو گیا تھا برخوردار کی منگنی ختم ہونے کے ساتھ اپنا بھی گھر بگڑ چلا تھا۔

بجائے اس کے کہ مرزا جی کی بیوی جا رہی تھیں بیچارے مرزا جی کو یک بینی و دو گوش صحیح سلامت لے کر باہر کو جاتے بن پڑی۔ اس طرح جھگڑا ختم ہوا۔ اس کے بعد مرزا جی نے پھر کبھی اس بارے میں بیوی سے کوئی ذکر نہ

چھیڑا۔ ہاں دل میں یہ ضرور ٹھان لی کہ کوئی بہانہ تلاش کرکے اس معاملہ کو خود ہی ختم کروں گا۔ انھوں نے اپنا ارادہ کسی پر ظاہر نہ کیا۔ گھر میں جب کبھی اس بارے میں کوئی بات ہوتی تو بیوی کی ہاں میں ہاں ملا دیتے اور بیوی بھی یہی سمجھتی کہ صرف ایک ہی دن کی دھمکی کام کر گئی۔

ایک روز شام کو اچانک سنا کہ زمیندار صاحب آگئے ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ گاڑی بان کو نہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بجائے گاڑی بان کے وہ خود گاڑی ہانکتے ہوئے اپنے گھر آئے تھے۔ گاڑی بان ان کا وفادار بہت پرانا ملازم تھا۔ جب زمیندار صاحب اس حالت میں پہونچے تو گاڑی بان کے بیوی بچے بہت پریشان ہوکر ان کو دیکھنے لگے۔ لیکن اتنی ہمّت اور جرأت نہ ہوئی کہ وہ اپنے باپ کے بارے میں کچھ پوچھ سکیں۔ گاڑی بان کی بیوی تو یہ حالت دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔ اور کسی نے اس کی طرف توجہ بھی نہ کی۔ عورت ہی عورت کے چہرے کو دیکھ کر اندازہ کر سکتی ہے کہ اس کا کیا منشا ہے۔ صرف زمیندار صاحب کی بیوی جو اُس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو دیکھ رہی تھی تاڑ گئی۔ اُس نے گاڑی بان کی بیوی کو ایک طرف بلا کر پوچھا۔

شکیلہ تم بہت پریشان نظر آرہی ہو۔

بیگم صاحب یہ کیسے ہو سکتا ہے ــــــــ اور اب جبکہ نواب صاحب بخیریت اپنے گھر پہونچ گئے ہوں۔ پھر پریشانی کیوں ہو۔ میں تو ان کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگتے تھک گئی تھی۔

تو میں یہ سمجھوں کہ تم خوش ہو۔

بالکل بیگم صاحب ـــــ خدا نے میری دعا قبول کرلی۔

زمیندار صاحب کی بیوی نے خاوند کی طرف رُخ بدلتے ہوئے پوچھا۔

ہمارا گاڑی بان کہاں ہے؟

شکیلہ جو گاڑی بان کی بیوی تھی خاوند کا ذکر چھڑتے ہی گھونگھٹ کو پکڑتے ہوئے ایک طرف کو سمٹ گئی، لیکن کان خاوند کی خیریت معلوم کرنے کیلئے بیقرار تھے۔ زمیندار صاحب نے ایک نظر اپنی بیوی پر اور ایک نظر شکیلہ پر ڈالی ـــــ وہ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد مسکراتے ہوئے بولے۔

بیگم کس بے وفا کا ذکر کر رہی ہو۔

کیا مطلب؟

کیا بتاؤں بڑی اُلجھن میں پڑا ہوں۔

بیگم صاحبہ نے ایک نگاہ شکیلہ پر ڈالتے ہوئے۔

کیوں شکیلہ ـــــ نواب صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟

جی ـــــ ٹھیک ہے۔

واقعی بے وفا ہے؟

بھلا آپ کے سامنے انکار ـــــ خدا وہ دن ہی نہ دکھلائے۔

زمیندار صاحب نے دوسرے کمرے میں جاکر تولیہ لیا اور غسل خانے میں چلے گئے۔ بیوی نے جلدی جلدی دوسرا لباس صندوق میں سے نکالا

اور غسل خانہ میں پہنچا دیا۔ شکیلہ بے چاری وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی۔ بالکل جیسے اُسے سانپ سونگھ گیا ہو ــــــ اُس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔
اُسے کیا خبر تھی کہ وہ اب کبھی اپنے خاوند کو نہ دیکھے گی ــــــ دنیا والوں کی پابندیاں عائد ہو جائیں گی ــــــ اُس کو رنگا ہوا کپڑا استعمال کرنا حرام ہو جائے گا، اُس کے ہاتھ ہمیشہ کے لئے چوڑیوں سے محروم ہو جائیں گے۔ ہاتھوں میں مہندی لگانا خواب و خیال ہو جائے گا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ آج دل کیوں بیٹھا جا رہا ہے۔ ایسی حالت تو عمر بھر میں کبھی نہیں ہوئی۔ ــــــ ضرور کوئی نئی بات ہے۔

شکیلہ نیچی نگاہیں کئے خاموش کھڑی تھی کہ بیگم صاحب نے اپنی طرف مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

ارے تم ابھی تک وہیں کھڑی ہو، بیٹھ جاؤ۔

بیگم صاحب میں آرام سے کھڑی ہوں۔

خدا کی پناہ بڑی محبت ہے ــــــ کیوں نہیں خاوند ہے۔

بیگم صاحب آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔

میں اُڑتے جانور کو دیکھ کر پر کھ لیتی ہوں۔ غسل خانہ سے آ جائیں ابھی پوچھتی ہوں۔

بیگم صاحب کوئی اور بات کیجئے۔

کیا غلط کہہ رہی ہوں۔ اچھا کہہ دے کہ محبت نہیں۔

مجھے تو بالکل نہیں۔ شکیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

کیا سچ کہہ رہی ہے ——— یہ سب باتیں کہوں گی آجائے ذرا۔
کہہ بیٹا ——— آپ کو کون روک سکتا ہے۔
شکیلہ نے اپنے چھوٹے لڑکے کا ہاتھ پکڑا، اور اپنے دل کو تسلی دیتے ہوئے گھر کی راہ لی۔ ہاں چلتے چلتے بیگم صاحب سے پھر اتنا کہا۔
نواب صاحب سے معلوم تو کر ہی لینا۔
بیگم صاحبہ کو یہ سن کر ہنسی آگئی، شکیلہ سمجھ گئی کہ پھر مذاق کرنے والی ہیں۔ لمبے لمبے قدم رکھتی ہوئی چلی گئی۔ بیگم صاحبہ نے آواز بھی دی مگر اس نے مڑکر بھی نہ دیکھا۔
شکیلہ جانے کو چلی تو گئی مگر اُس کے دل کی حالت اور زیادہ خراب ہوتی چلی گئی۔ طرح طرح کے خیالات نے پریشان کردیا۔ بہت کوشش کی کسی طرح دھیان بٹ جائے۔ مگر وہی خیالات بڑھتے چلے گئے۔ اسی پریشانی میں سب گھر کے سب کام بھول گئی بلکہ گھر میں جنون زدہ کی طرح چکر لگاتی پھرنے لگی۔ چھوٹے چھوٹے بچے ماں کی اس حالت کو دیکھ خاموش تھے کہ آج نہ اُن سے بولتی ہے، نہ اُن کی طرف کوئی توجہ کرتی ہے۔ ان معصوموں کو کیا خبر تھی کہ اب وہ یتیم ہو چکے ہیں۔
شکیلہ کو گھر میں بھی چین نہ آئی تو پھر زمیندار صاحب کے گھر پہونچی۔ نواب صاحب ابھی تک غسل سے فارغ نہ ہوئے تھے۔ وہ بغیر کچھ کہے واپس چلی آئی۔ نواب صاحب کی بیوی نے اس کو دیکھ لیا تھا۔ اس لئے انھوں نے سب سے پہلے یہی کام کیا، جوں ہی زمیندار صاحب غسل خانے سے آکر اپنے

کمرے میں پہونچے تو بیگم بھی پیچھے پیچھے ان کے کمرے میں پہونچیں۔ بجائے اس کے
کہ وہ خاوند سے سفر کے حالات اور خیریت پوچھتیں۔ پہلا سوال یہی کیا۔
ہمارا گاڑی بان کہاں ہے؟ اس کی بیوی بہت پریشان ہے۔
زمیندار صاحب تجربہ کار آدمی تھے، سوچا کہ اگر صاف بات بتادی
تو اسی دم کہرام مچ جائے گا۔ فوراً بات پلٹ دی۔
وہ وہیں رہ گیا ہے۔
کہاں؟
تمھارے داماد کے پاس۔
کس لئے؟
افضل بیگ نے روک لیا ہے۔
یہ سن کر بیگم صاحبہ کے چہرے پر خوشی اور اطمینان ظاہر ہوا مگر زمیندار
صاحب کی اس بات سے کچھ سوچ اور فکر میں پڑ کر خاموش ہوگئیں۔
بیگم کو دیکھ کر زمیندار صاحب بولے۔
بیگم خاموش کیوں ہوگئیں؟
بس یہی پوچھنا تھا۔
اس کے علاوہ بھی کچھ اور بات ہے؟ زمیندار صاحب نے برابر اصرار
کیا تو بیوی نے کہا۔
آپ کو کچھ خیال نہ آیا؟
کس بات کا؟

ابھی سے اتنا گرنے لگے۔

اس میں گرنے کی کونسی بات ہے؟

سمجھنے کے لئے بہت کچھ ہے، ورنہ کچھ بھی نہیں۔ سوت نہ کپاس کولی سے لٹھم لٹھا ـــــــ کنوارے رشتے میں یہ بات اچھی نہیں لگتی۔

بیگم نہ معلوم تمھاری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ زبان سے غیر کو اپنا بنایا جاتا ہے۔ تمھارے اس سوال سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب چاہو کچے دھاگے کی طرح توڑ دو ـــــــ یہی بات ہے نا؟

تقریر کرنے لگے۔ دماغ پر بھی زور دیا کرو۔

یعنی؟

افضل بیگ تمام بھید معلوم کرے گا۔

اول تو ایسا ہو نہیں سکتا کہ گاڑی بان یہ حرکت کرے، اور اگر کرتا تو ہمیں کس بات کا ڈر۔ کوئی ڈاکو یا چور ہیں ـــــــ خدا کا شکر ہے کہ ہم جیسا خاندانی نہ مل سکے گا۔

بڑا بول نہ بولو۔ قدرت ذرا سی دیر میں کچھ کا کچھ کر دیتی ہے۔ ابھی غدر کا زبردست انقلاب دیکھ چکے ہو۔ پھر بھی آنکھیں نہیں کھلیں۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سامنے سے شکیلہ آتی ہوئی دکھائی دی۔ بیگم صاحبہ نے مذاقیہ طور پر کہا۔

بڑی بے چین ہو رہی ہو۔

ادھر دیکھا تو ٹھٹھک کر رہ گئی۔ نواب صاحب سامنے ہی بیٹھے ہوئے

تھے ــــــــــــ نواب صاحب نے دماغ سے بوجھ دور کرنے کے لئے دوسری طرف دھیان بٹاتے ہوئے کہا۔

تم اُس کے لئے اتنی بے چین ہو مگر اُس کو تمھاری پرواہ نہیں ہے۔

شکیلہ نواب صاحب کی آواز سن کر شرم سے اور بھی جھک گئی لیکن جہاں میاں کی محبت کا تعلق ہے اسی محبت اور جذبہ سے کام لیتے ہوئے ہمت کر کے اتنا جواب تو دے ہی دیا۔

وہ خاوند ہیں ــــــــــ سرکار خاوند کا درجہ بہت بڑا ہے۔

نواب صاحب نے پھر ذرا سنجیدہ ہو کر کہا۔

شکیلہ تمھارا شوہر افضل بیگ کے پاس رہ گیا ہے۔ میں بھی اس تو جہ سے چھوڑ آیا ہوں کہ افضل بیگ شکار کرنے لگے تھے۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ جلد ہی آجائے گا۔ تمھیں جس چیز کی ضرورت ہو کہہ دینا۔

بہت بہتر ہے۔

شکیلہ اتنا کہہ کر اپنے گھر چلی گئی۔ نواب صاحب کے دل پر اس کا اثر کافی تھا۔ مگر گاڑی بان کی موت کے بارے میں اُن کو شک تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ مرنے والا کوئی ڈاکو بھی ہو سکتا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ گاڑی بان کی تمام زندگی نواب صاحب کے ہاں گزری تھی اور کبھی ایسا موقعہ نہ آیا تھا کہ وہ کسی سے لڑا ہو۔ یا اُس نے کوئی چھل یا فریب کیا ہو۔ ڈاکہ ڈالنا تو بہت بڑی بات ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچتے کہ آخر گاڑی بان گیا تو کہاں گیا۔ یہ بھی خیال آیا کہ اس کے

بارے میں صحیح علم افضل بیگ کے والد کو ہوگا۔ اُن سے معلوم کیا جائے۔ مگر پولیس کے ہاتھوں جو بے عزتی ہو چکی تھی اُس کا نقشہ سامنے آجاتا تھا، اور قدم جوں کے توں رُک جاتے۔ دوسری طرف افضل بیگ کے والد بھی اپنی جگہ چپ رہتے۔ انھوں نے بھی اس حادثے کی ہوا نہ آنے دی۔ اور یہاں تک بات پہنچی کہ افضل بیگ کے والد نواب صاحب سے ملنے جاتے تو وہ گھر میں بیٹھے بیٹھے یہ کہلا دیتے کہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ وہ اپنا سا منہ لے کر واپس آجاتے۔

دو مہینے گزر گئے۔ نواب صاحب گاڑی بان کی طرف سے جھوٹے خط لکھ کر شکیلہ کے نام بھیجتے رہے۔ پوسٹ مین خط لاکر دیدیتا۔ وہ تو جاہل ہی تھی خط لیکر خوشی خوشی نواب صاحب کے گھر پہنچ جاتی۔ بیگم صاحب خط کو دیکھ کر حیران رہ جاتی تھیں کہ تحریر تو نواب سی ہے مگر خط شکیلہ کے خاوند نے بھیجا ہے۔ اسی طرح ہر مہینہ منی آرڈر بھی آتے رہے۔ شکیلہ بہت خوش تھی۔ ہر ہفتہ جب خاوند کا خط مل جاتا تھا تو بچے خط آنے پر شکیلہ سے پوچھتے کہ ابا کب آئیں گے وہ بچوں کو بہلا پھسلا کر دوسری باتوں میں لگا لیتی۔ قدرتی بات ہے کہ اس عرصے میں شکیلہ کے منہ سے کبھی نہ نکلا

وہ جلد آجائیں گے۔

اس لئے کہ آنے کے لفظ پر اس کی زبان خود بخود رُک جاتی تھی۔

ایک روز نواب صاحب نے شکیلہ کو اپنے گھر بلا کر یہ ہدایت کی کہ وہ اپنا کل سامان لے کر یہاں چلی آئے۔ کیونکہ وہ اپنے گھر میں اکیلی تھی۔ گھر میں سوائے معصوم بچوں کے کوئی کوئی مرد نہ تھا جو شکیلہ کی دیکھ بھال کر سکے۔

نواب صاحب کے حکم پر اُس کی کیا مجال تھی کہ وہ ٹال دیتی، وہ اُس در کی نمک خور تھی۔ جیسا نواب صاحب نے چاہا اُس کو پورا کر دیا گیا۔ شکیلہ کوئی پچیس سال کی ہوگی۔ مگر اس غربت میں بھی اُس کا حسن اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔ وہ گاؤں کی سیدھی سادی عورت تھی۔ لیکن اپنی ہم عمر عورتوں میں وہ سب سے زیادہ سنجیدہ تھی۔ نواب صاحب نے اُس کو اپنے گھر میں کیوں رہنے کو کہا، وہ اتنا ہی سمجھتی تھی کہ نواب کو مجھ سے اور بچوں سے ہمدردی ہے۔ کیونکہ اُس کے پُرانے اور نہایت وفادار ملازم کی بیوی اور بچے ہیں۔ لیکن بیگم صاحب کو شکیلہ کا ان کے مکان میں آنا ناگوار گزرا ـــــ نہ معلوم کیوں ؟

اس لئے کہ شکیلہ جوان تھی ـــــ حسین تھی ـــــ اور غریب بھی۔ اُن کو نواب صاحب پر بھروسہ نہ تھا، وہ اُن کی عادت سے خوب اچھی طرح واقف تھیں۔ اس بیگم صاحب کی تیوری میں بل پڑے۔ شکیلہ کو بھی اس کا احساس ہوا۔ آخر سمجھدار تھی۔ لیکن مجبور تھی، اُس کا خاوند اُس کے پاس نہ تھا۔ بس لے دے کر ایک یہی گھر تھا۔ اگر یہاں سے بگڑے تو کہاں جائے۔

بیگم صاحبہ شکیلہ کی کڑی نگرانی کرنے لگیں اور خاص کر اُس وقت ب صاحب اپنے گھر میں موجود رہتے تھے۔ چونکہ شکیلہ نیک دل اور پاک باطن تھی اُس نے اپنی مجبوریوں کو دیکھتے ہوئے بیگم سب باتوں کو برداشت کیا۔ اگر بیگم نے ہر طرح اُس کا امتحان لیا۔ لیکن ان کی زیادتیوں

اس کے دل میں کافی نفرت ہوگئی تھی۔ بس اتنا سوچ کر خاموش ہو جاتی کہ خاوند کے آنے پر یہ پریشانیاں رفع ہو جائیں گی۔ لیکن اس غریب کو کیا خبر تھی کہ جو کچھ قدرت کو منظور تھا وہ ہو چکا۔ اس کا خاوند ہمیشہ کے لئے اُس سے جدا ہو گیا۔ وہ نواب صاحب کے فریب سے سہاگن کے روپ میں بیوہ ہے۔

اسی طرح چھ ماہ گزر گئے۔ نواب صاحب جعلی خط لکھوا کر برابر شکیلہ کے نام بھیجتے رہے۔ ایک بار غلطی سے نواب صاحب نے خود ہی خط لکھ کر بھیج دیا۔ یہ خط نواب صاحب کے مکان پر شکیلہ کو مل گیا۔ حسب معمول شکیلہ نے وہ لے لیا، اور رضیہ کو جو نواب صاحب کی بچی تھی دے کر پڑھنے کو کہا۔

رضیہ اپنے باپ کی تحریر کو خوب پہچانتی تھی، خط کو دیکھتے ہی کہہ گئی کہ یہ تحریر تو ابا جان کی ہے۔ شکیلہ بھی کوئی بچی نہ تھی رضیہ کے اس طرح غور سے خط کو دیکھنے اور تامل کرنے پر شبہ ہو گیا۔ خط میں جو کچھ تحریر تھا وہ پڑھ کر سنا دیا۔

شکیلہ نے خط سن تو لیا، لیکن شک بڑھتا چلا گیا۔ رضیہ سے اُس کے تامل کی وجہ معلوم کرنے کے لئے کافی اصرار کیا مگر رضیہ نے اُس کا وہم ہے کہہ کر ٹال دیا۔ لیکن شکیلہ کا اطمینان نہ ہوا۔ اور اس راز کو معلوم کرنے کے لئے تدبیر سوچنے لگی۔ بہت کچھ سوچنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ افضل بیگ کے گھر پہونچ کر معلوم کیا جائے۔ اس لئے وہ اپنے گھر خیریت بھیجتے ہوں گے۔ وہاں سے شاید اطمینان بخش جواب مل سکے۔

ایک روز گھر کے کام سے فارغ ہو کر شکیلہ افضل بیگ کے گھر جانے لگی، بیگم صاحبہ نے جہاں اُس پر بہت سی پابندیاں لگا رکھی تھیں اُن میں ایک یہ بھی تھی کہ وہ گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتی۔ اسی لئے شکیلہ کو گھر سے باہر جاتے دیکھ کر ایک دم کڑک کر بولیں۔

کہاں جا رہی ہے؟

شکیلہ سہم کر وہیں کی وہیں کھڑی رہ گئی، آنکھوں میں آنسو بھر آئے بیگم صاحبہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

پڑوسن کے پاس۔

کوئی ضرورت نہیں —— اتنی آزادی بھی کس کام کی —— معلوم ہوتا ہے تو ضرور ہمارے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگوائے گی۔

اتنا سن کر شکیلہ آنسو پونچھتی ہوئی واپس گھر میں آکر بیٹھ گئی۔

تیسرا باب

شہر پھر شہر ہوتا ہے ۔ افضل بیگ اپنے قصبہ کو بالکل بھلا چکا تھا، اُس کو کبھی بھول کر بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ اُس کی پچھلی زندگی ایک نہایت غریب گھرانے میں بسر ہوئی ہے، اور اُس کے پالنے میں والدین کو کتنی پریشانیاں اٹھانی پڑی ہیں ۔ اتنی بات ضرور تھی کہ وہ تنخواہ ملنے پر آدھی رقم ہر ماہ اپنے والد کو ضرور روانہ کر دیتا تھا ۔ ہاں فالتو اوقات میں اپنی تعلیم بھی برابر جاری رکھی ۔ اسی طرح کوشش کرتے کرتے میٹرک کی سند حاصل کرلی ۔
اُس زمانے میں میٹرک کی قیمت آج کے ایم۔اے سے کہیں زیادہ تھی ۔ جب اِس کے متعلق اُس کے افسران کو معلوم ہوا تو اُنھوں نے ترقی دے کر پوسٹ مین کی بجائے انسپکٹر بنا دیا، آمدنی میں معقول اضافہ ہوگیا۔ قدرتی بات ہے کہ جتنی آمدنی ہوتی ہے اتنی ہی معاشرت بڑھ جاتی ہے جس سے

۱۷۷۷۵

خرچ بھی ضرور بڑھ جاتا ہے۔ لیکن افضل بیگ نے تنخواہ کی اس ترقی اور اضافہ میں والدین کی ماہانہ امداد میں کوئی اضافہ نہ کیا۔ بلکہ والدین کو اپنی اس ترقی کی اطلاع بھی نہ کی۔ اس لیے کہ کبھی والدین خوشی سنانے کے ساتھ ساتھ ماہانہ رقم میں اضافے کا مطالبہ نہ کر دیں۔

اس ترقی کو ہوئے کافی عرصہ گزر گیا، افضل اپنا پوسٹمینی کا زمانہ بھی بھول گیا، اُس کو محکمے کی طرف سے ایک مکان ملا ہوا تھا جو خانساماں کا کام انجام دینے کے علاوہ چوکیداری بھی کرتا تھا۔

ایک روز اچانک افضل بیگ کو ایک خط اس کے گھر سے آیا ہوا ملا، وہ خط شکیلہ نے بھیجا تھا ——— اپنے خاوند گاڑی بان کی خیریت معلوم کرنے کے لئے۔ افضل بیگ گاڑی بان کا نام پڑھ کر چونک اُٹھا اُس کی آنکھوں کے سامنے وہی نقشہ آگیا۔ اس نے فوراً ہی جواب لکھا کہ گاڑی بان کو مرے ہوئے ایک مدّت گزر چکی ہے۔ اس نے اسی مضمون کا ایک خط اپنے والد کو بھی لکھ دیا تاکہ وہ اس کی بیوی کو سمجھا دیں۔ جو خط شکیلہ کے نام بھیجا تھا وہ نواب صاحب کی معرفت تھا۔ اس لئے وہ وہ خط شکیلہ کے پاس نہ پہنچ سکا۔ اس لئے وہ بیچاری انتظار ہی کرتی رہی۔ لیکن جواب نہ آنا تھا نہ آیا۔ اور آتا بھی کیسے۔ مگر جو خط افضل بیگ نے اپنے والد کو لکھا تھا، وہ ان کو مل گیا، لیکن جو بات افضل بیگ چاہتا تھا وہ پوری نہ ہو سکی۔ کیونکہ شکیلہ پر نواب صاحب کی طرف سے سخت نگرانی تھی، اس کو اتنی بھی اجازت نہ تھی کہ غیر عورت یا بچے سے بات کر سکے۔

افضل بیگ کے والد نے کافی کوشش کی کہ شکیلہ کو کسی ذریعے سے بتا دیا جائے کہ وہ بیوہ ہو گئی ہے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔

انسان بعض اوقات انسان کے ہاتھوں کتنا مجبور ہو جاتا ہے۔ طاقتور کمزور پر حاوی ہوتے وقت یہ نہیں سوچتا کہ اس سے بڑھ کر بھی کوئی دوسری طاقت ہے۔ لیکن قدرت کی طرف سے کیے کا بدلہ ضرور ملتا ہے۔ اچھائی کا اچھائی سے اور برائی کا برائی سے۔ مگر انسان یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی آنکھ نہیں کھولتا۔

شکیلہ کو اپنی زندگی ایک بوجھ معلوم ہونے لگی۔ اس کی اداسی کو چھوٹے چھوٹے بچے بھی محسوس کرنے لگے۔ وہ اندر ہی اندر غم میں گھلتی رہی۔ وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ اور اس گھر میں کون ایسا تھا جو اس کی دلجوئی کرتا۔ آخر ایک دن ایسا آیا کہ وہ بستر پر سوار ہو گئی۔ اس کو ہر وقت ہلکا ہلکا سا بخار بھی رہنے لگا تھا۔ مگر بیگم صاحبہ کو شکیلہ کی علالت کا یقین نہ تھا۔ وہ شکیلہ کی مکاری سمجھتی رہیں۔ اس کو اسی خیال سے ایک کونے میں ڈال دیا۔ جب کوئی دیکھ بھال نہ ہوئی تو بیماری زور پکڑ گئی۔ یہاں تک کہ حالت خطرناک ہو گئی۔

اتفاق سے اسی اثنا میں بیگم صاحبہ کے بھائی اور بھابی آ گئے۔ بیگم اور نواب صاحب ان کی آؤ بھگت میں ایسے منہمک ہوئے کہ شکیلہ کی طرف بالکل توجہ نہ رہی۔ شکیلہ نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا، باوجود بیماری اور کمزوری کے آنکھ بچا کر گھر سے نکل کر افضل بیگ کے گھر پہنچ گئی۔

نواب صاحب نے جس حقیقت پر پردہ ڈال رکھا تھا وہ ہٹ گیا۔ شکیلہ کو معلوم ہوا کہ وہ بیوہ ہوگئی ہے۔ اُس نے چوڑیاں ٹھنڈی کردیں۔ یہ اُس کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے اس پر سکتہ سا طاری ہوگیا ——— وہ کسی گہری سوچ میں پڑگئی۔ اُس کے دونوں بچّے اُس کے ساتھ نہ تھے، کیونکہ وہ تو بہت ہوشیاری اور تیزی سے آئی تھی، بچوں کو ایسی صورت میں کیسے لاسکتی تھی۔

افضل بیگ کی والدہ نے دوچار دفعہ بچوں کی طرف دھیان دلایا لیکن شکیلہ نے نہ معلوم کیوں لاپرواہی برتی۔ اُس کی نظروں میں دنیا فریب کا جال تھی

بیماری کی وجہ سے اُس کی بھوک تو ختم ہو ہی گئی تھی، لیکن زندہ رہنے کے لئے بھی تو تھوڑا سا کھانا بھی کھا لینا اس کو گوارا نہ تھا۔ ہرچند اُس کو سمجھایا گیا مگر وہ اپنی ضد پر اڑی رہی اور اسی کشمکش میں رات ہوگئی۔ افضل بیگ کے والد اس کے بچوں کو لانے کے لئے چلنے لگے تو اُن کو منع کردیا۔ ان لوگوں کو معصوم بچوں کی طرف سے بہت پریشانی ہورہی تھی، مگر شکیلہ کے اتنا کہنے پر کہ اگر بچّے یہاں آگئے تو میں اپنی جان کھودوں گی خاموش ہوگئے۔

اس گھر میں دو عورتیں افضل بیگ کی بہن اور والدہ بھی تھیں۔ وہ ایک بیوی اور ایک ماں ہونے کا تجربہ رکھتی تھیں۔ شکیلہ کی اس سخت دلی کو دیکھ کر اس کا سبب معلوم کرنے کی کوشش میں لگ گئیں۔

کئی روز گزر گئے۔ نہ ماں نے بچوں کو دیکھا اور نہ ہی بچوں کو یہ معلوم ہو سکا کہ ان کی ماں کہاں گئی۔ البتہ نواب صاحب کو شکیلہ کے اس طرح غائب ہو جانے پر تشویش تھی۔ اس کے ساتھ ہی اُن کو اپنے جرم کا احساس تھا، اسی سبب یہ پریشانی تھی۔ آخر تمام بندشیں بیکار ہوئیں۔ اور جس بات کا خطرہ تھا وہ پیش آیا۔ اُن کی خواہش تھی کہ شکیلہ افضل بیگ کے گھر نہ جائے۔ ورنہ دو کوڑی کی ہو جائے گی۔ شکیلہ کے اچانک غائب ہونے پر انھوں نے کافی چھان بین شروع کر دی تھی لیکن کوئی پتہ نہ چل سکا

اس معاملہ میں شکیلہ نے بھی کافی ہوشیاری دکھائی۔ وہ صحن میں اُس وقت آتی جب گھر میں کوئی غیر نہ ہوتا۔ وہ فوراً ہی صدر دروازے کے کواڑ بند کرا دیتی تھی اور ضروریات سے فارغ ہو کر اپنی کوٹھری میں جا کر لیٹ جاتی۔

افضل بیگ کے والدین شکیلہ کی تیمارداری اس لئے بھی کر رہے تھے کہ وہ نواب صاحب کے گھر کا بھید بھاؤ سے سکیں۔ کیونکہ اُن کے گھر جو دلہن آنے والی تھی وہ نواب صاحب کی بھتیجی لڑکی تھی۔ غرضکہ شکیلہ کی تیمارداری اور علاج میں ان لوگوں نے پوری توجہ اور کوشش سے کام لیا۔ چند ہی روز میں وہ تندرست نظر آنے لگی

رفتہ رفتہ افضل کی والدہ اور بہن نے نواب صاحب کے گھر کے مکمل حالات معلوم کر لئے۔ نواب صاحب کے بارے میں بھی ایسی ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن کا وہم و گمان بھی نہ تھا، اور جن کو سن کو کانوں پہ ہاتھ

رکھ لیے اور نواب صاحب کی جو وقعت ان کے دلوں میں تھی نکل گئی ۔ اور جس وقت شکیلہ نے بتایا کہ وہ .... تو پورے گھر میں ایک کہرام مچ گیا، اور افضل کے والد کی آنکھوں میں مارے غصّے کے خون اتر آیا۔

یہ حالات معلوم ہونے پر یہ لوگ نواب صاحب کو کیا کہہ سکتے تھے۔ سوائے اس کے کہ افضل کی منگنی کو ختم کردیں یا زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا تھا کہ نواب صاحب کو خوب رسوا کریں ۔ مگر اس سے فائدہ کیا۔ بہت کچھ سوچ بچار کے بعد یہی طے پایا کہ نواب صاحب کے یہاں افضل بیگ کی شادی نہ کی جائے ۔ اور اسی روز افضل کی والدہ نے نواب صاحب کے مکان پر پہنچ کر بیگم صاحبہ کو اپنے اس فیصلے سے مطلع کردیا۔ جو مہمان اس وقت گھر میں آئے ہوئے تھے یہ منحوس خبر سنکر دنگ رہ گئے۔ اگرچہ اُن لوگوں نے بھی ایسا نہ کرنے پر بہت کچھایا۔ لیکن افضل کی والدہ نے تمام داستان سنائی ۔ اور پھر اپنے گھر لوٹ آئیں ۔

نواب صاحب کے گھر میں سوگ منایا جارہا تھا، ادھر افضل بیگ کے گھر میں خوشیاں ۔ ہوا یہ کہ جس وقت افضل بیگ کی والدہ نواب صاحب کے گھر سے لوٹ کر اپنے گھر آئیں تو اسی وقت پوسٹ مین نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ والد باہر آئے تو پوسٹ مین نے افضل بیگ کا ایک منی آرڈر اور ایک لفافہ دیا ۔ لفافہ میں خیریت کے ساتھ ساتھ ترقی کی خبر بھی تحریر تھی ۔ اور منی آرڈر کی رقم مقررہ تعداد سے تین گنا زائد تھی ۔ ایسی صورت میں ماں باپ جتنا بھی خوش ہوتے کم تھا ۔

افضل بیگ کی ترقی کو دیکھ کر سب لوگوں کے دل میں یہ خیال گزرا کہ منگنی کا چھوڑنا ہی بھاگوان ثابت ہوا، اور نواب صاحب کی لڑکی کو منحوس قرار دیا گیا۔

یہ ہمارے یہاں کا قاعدہ ہے کہ منگنی اگر لڑکی والے ختم کرتے ہیں تو کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن اگر لڑکے والے جواب دیتے ہیں بہت بُرا سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ لوگ باگ طرح طرح کی من گھڑت باتیں نکالتے ہیں۔ اس طرح اس لڑکی کی دوسری منگنی میں رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں لڑکے تو عام طور پر ایسی باتوں کا اثر نہیں لیتے۔ لیکن لڑکیاں منہ سے تو کچھ کہتی نہیں لیکن حساس زیادہ ہونے کے باعث بہت اثر لیتی ہیں۔ اور اندر ہی اندر دل میں گھٹتی رہتی ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ تپ دق کا شکار ہو جاتی ہیں۔

یہی حال نواب صاحب کی صاحبزادی کا ہوا۔ مخالفوں نے خبر ملتے ہی طرح طرح کے افسانے گھڑ ڈالے۔ قصور جو کچھ تھا وہ نواب صاحب کا تھا۔ لڑکی کنواری ہونے کے باعث کوئی جواب تو دے نہ سکی۔ یہ باتیں نواب صاحب کے خاندان کے لئے معمولی نہ تھیں۔ صدیوں کا خاندانی وقار اور عزت ایک غلطی کی نذر ہو گئے۔

جوان بیٹی کو خاموش اور اداس دیکھ کر بیگم بہت کچھ تسلی دلاسا دیتیں لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ ہر وقت خاموش اپنے کمرے میں پڑی رہتی۔ اس طرح سوچتے سوچتے وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ شادی اگر ہو تو افضل بیگ کے

ساتھ ورنہ اپنی پوری زندگی یوں ہی ختم کر دینی چاہیئے۔
لڑکی نے یہ فیصلہ کر تو لیا لیکن یہ نہ سوچا کہ اس کو پورا کیسے کرونگی۔ والدین کو پریشان دیکھ کر بیگم کی ہاں میں ہاں ملا دیتی، لیکن اپنے فیصلہ اور عزم کو پورا کرنے کے لئے وہ شکیلہ کو ایک بڑا ذریعہ بنا چکی تھی۔ اس لئے اس کی آمد کا انتظار کرنے لگی۔

افضل کی والدہ نے شکیلہ کے دل میں نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کی طرف سے اتنی نفرت اور برائیاں ڈال دی تھیں کہ وہ سخت سے سخت دشمن بن گئی۔ ہر وقت انتقام لینے پر آمادہ رہتی۔ لیکن شکیلہ کا نواب صاحب کے مکان میں جانا ناممکن تھا۔ کیونکہ اس تمام قصہ کا بانی شکیلہ کو سمجھا جا رہا تھا۔ آخر شکیلہ نے ایک راہ نکالی اور وہ پوشیدہ پوشیدہ نواب صاحب کے ایک پڑوسی کے ہاں جانے لگی۔ ان لوگوں کو اس پر آمادہ کر لیا کہ اس کے آنے کا راز نواب صاحب کے گھر والوں پر ظاہر نہ ہو۔
کافی دنوں تک شکیلہ آتی جاتی رہی اور کسی کو خبر نہ ہوئی۔ شکیلہ نے وہاں بیٹھ کر نواب صاحب کی لڑکی نسرین کے بارے میں ایسی باتیں کیں کہ ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اس کو نسرین سے بے حد محبت ہے۔ بعض دفعہ تو نسرین کا ذکر کرتے ہوئے شکیلہ آنکھوں میں آنسو بھر لاتی۔ ایسی صورت میں دیکھنے والوں کے دل میں ہمدردی پیدا ہو جاتی۔

ایک روز پڑوسن نواب صاحب کے ہاں گئی، اس نے موقعہ پا کر نسرین کو یہ بتا دیا کہ شکیلہ کو اس سے بے حد محبت ہے اور وہ اُس کو یاد

کرکے رو تی ہے۔ بیتاب ہو کر پھڑک اُٹھی۔ اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ والدین کا بھی ڈر تھا کہ کہیں شکیلہ کے آنے کی ان کو خبر نہ ہو جائے۔ اور ان کی ناراضگی کے علاوہ پابندیاں بھی عائد ہو جائیں۔ جب یہ خیال اُس کو آتا تو تمام خوشی ختم ہو جاتی۔ بہرحال شکیلہ سے میل ملاپ رکھنے پر اُس نے آمادگی ظاہر کی۔ اس کے بعد شکیلہ جب پڑوسن کے ہاں آتی نسرین کو خبر کر دی جاتی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اُس وقت نواب صاحب اپنے مکان میں موجود ہوتے۔ اور نسرین مجبوراً دل کو مار کر رہ جاتی۔

اسی طرح دن گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ نواب صاحب کو بھی اتنا ملال نہ رہا۔ رفتہ رفتہ شکیلہ کے بچے بھی اُس کے پاس جانے لگے۔ بلکہ کبھی کبھی نواب صاحب بچوں کے ہاتھ شکیلہ کو کچھ بھیج دیتے تھے۔ اگرچہ شکیلہ اس کو قبول کر لیتی تھی۔ لیکن پچھلے واقعات کو بھولی نہ تھی۔

ایک روز شکیلہ نے نواب صاحب کی پڑوسن کے ہاں جا کر نسرین کو ملنے کے لئے بلایا۔ اس روز نواب صاحب بھی گھر میں موجود نہ تھے۔ نسرین شکیلہ کے پاس فوراً پہنچ گئی۔ دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئیں جوشِ محبت سے آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مزاج پرسی کے بعد پھر باتیں ہونے لگیں۔ دوران گفتگو میں افضل بیگ کے یہاں کا ذکر آگیا۔ نسرین نے شکیلہ کو اپنی خیر خواہ سمجھتے ہوئے اس پر یہ بھی ظاہر کر دیا کہ شادی تو وہیں ہوگی ورنہ جان دے دوں گی۔ یہ شرافت نہیں کہ ایک جگہ کے بعد کئی کئی جگہ

بات ہو۔ میری منگنی کس لئے توڑی گئی ــــــــــ کہ میرے والد کا قصور تھا۔ لیکن سزا مجھے مل رہی ہو۔ بہن اس معاملہ میں تم کچھ میری مدد کر سکتی ہو تو کرو۔ تمام عمر احسان مند رہوں گی۔ تم اگر فضل بیگ کی والدہ کو سمجھاؤ گی تو یقیناً مان جائیں گی۔ سنا ہے بہت نیک ہیں اور تمھاری بات بہت مانتی ہیں۔

شکیلہ تو خود ایسے موقعہ کی تلاش میں تھی کہ نسرین کے دل کا حال معلوم کرے۔ وہ اس خیال سے بہت کچھ کرنے کو آمادہ تھی۔ لیکن خود نسرین کی زبان سے یہ سنکر پھولی نہ سمائی۔ شکیلہ نے نسرین کو ہمدردانہ لہجے میں ایسی تھپکی دی کہ اس کو اپنی بات منوانے کا پختہ یقین ہو گیا۔ اتنی گفتگو کے بعد نسرین والد کے ڈر سے اپنے گھر واپس آ گئی۔

شکیلہ نے واپس جاکر فضل بیگ کی والدہ کو پوری بات سنائی۔ لیکن وہ اپنی بات کی ایسی پکی تھیں کہ ان پر ذرا بھی اس بات کا اثر نہ ہوا۔ شکیلہ کی نسرین سے ملاقات کیا ہوئی اب تمام تمام دن غائب رہنے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فضل بیگ کی والدہ کو شکیلہ کے چال چلن پر شبہ ہونے لگا۔ اب اس کی یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ صرف سونے کے لئے رات کو گھر پہنچتی۔ انھوں نے یہ سوچ کر کہ اس کی سفید پوشی اور گزر اوقات کا بظاہر کوئی ذریعہ نہیں ہے صاف صاف اس سے کہہ دیا کہ ہمیں تمھارے چال چلن پر شبہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جہاں تمام دن رہتی ہو وہیں رات بھی گزارو۔

دراصل بات یہ تھی کہ شکیلہ نے افضل بیگ کے گھر والوں پر اپنا بوجھ ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ لحاظ کی وجہ سے چوری چوری نواب صاحب کے پڑوس میں ایک خادمہ کی حیثیت سے ملازمت کرلی تھی۔ جب چال چلن تک شبہات پہونچے تو مجبوراً اس ملازمت کا اظہار کیا۔ چونکہ شبہات یقین کی حد تک پہونچ گئے تھے اس لئے اُس کی اس صفائی پر کسی کو یقین نہ آیا۔ بلکہ شکیلہ کی ایک مکاری سمجھی گئی۔ اور اتنا کسی نے گوارا نہ کیا کہ وہاں جاکر معلوم کرتے۔ یہ رنگ دیکھ کر شکیلہ کو بہت رنج ہوا۔ کرتی کیا سکتی تھی بیچاری اپنا دل مسوس کر رہ گئی۔ جب اس صورت میں کامیابی نہ دیکھی تو خوشامد سے کام لینا چاہا۔ اس میں ناکام ہوئی تو اپنا سامان لے کر خدا حافظ کہتے ہوئے اپنی مالکہ کے گھر کی راہ لی۔

جب اس طرح مالکہ کے گھر پہنچی تو مالکہ اس کو اس حالت میں دیکھ کر سوچ میں پڑ گئی۔ وہ سمجھ گئیں کہ شکیلا کی آج ضرور وہاں کسی بات پر کھٹ پٹ ہوگئی ہے۔ ورنہ پہلے کئی بار مالکہ نے اپنے مکان پر سونے کے لئے اس سے کہا تو انکار کر دیا۔ لیکن ضرور کوئی بات حد سے بڑھ گئی جو یہاں آنے پر مجبور ہوئی۔ شکیلہ نے اپنا بستر ایک کمرے میں چارپائی پر رکھ دیا۔ اور اپنے کام میں لگ گئی۔

صادق جو مالکہ کا سب سے بڑا لڑکا تھا گھر میں آیا تو اس بستر کو دیکھ کر بولا۔

امّی یہ اتنے گندے کپڑے کس کے ہیں؟

بیٹیا شکیلہ کا بستر ہے۔ اب یہ مستقل طور پر ہمارے یہاں آگئی ہے۔
صادق شکیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے :۔
ہوں، یہ بات ہے ــــــ لیکن فوراً بات پلٹتے ہوئے بولا :۔
بھلا اس گھر میں اتنی گنجائش کہاں ہے کہ اس کو الگ کمرہ دیا جاسکے۔
جہاں اب تک رہتی تھی وہاں کیا بات ہوئی ؟
صادق کی اس بات سے شکیلہ کو پریشانی ہوئی کہ اب کہاں جاؤں، لیکن صادق کی والدہ فوراً بولیں۔
بیٹیا اتنا سخت دل نہ ہونا چاہیئے۔ ان لوگوں کی زندگی سے عبرت لو کہ خدانے تم پر کتنا فضل و کرم کر رکھا ہے۔ یہ مصیبت کی ماری در در کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے۔ نہ کوئی گھر نہ کوئی وارث۔ تم ان پر ترس کھاؤ، خدا تم کو اس کا اجر دے گا۔
بہت بہتر، مجھ سے غلطی ہوئی۔ آئندہ نہ کہوں گا ــــــ لیکن اس کو اپنے ہی کمرے میں رکھنا۔
یہ کب کہہ رہی ہوں کہ تمھارے کمرے میں رہے گی۔
تو اس سے کہو کہ میرے کمرے سے اپنا بستر اٹھائے۔
صادق کی والدہ نے شکیلہ کو اشارہ کیا، وہ فوراً صادق کے کمرے سے اپنا بستر اٹھالائی ــــــ صادق نے اس وقت یہ ایک کھیل کھیلا تھا۔ کہ والدہ کو شبہ نہ ہوجائے۔ ورنہ عیاشی اس کی رگ رگ میں رچی ہوئی تھی۔ یہ چیز اس کو ماحول سے ملی تھی۔ شکیلہ پر اس کی نگاہ کئی بار پڑچکی تھی۔

اور خاصکر اُس وقت جب نواب صاحب کی صاحبزادی سے اس کی گھنٹوں باتیں
ہوتیں ۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ کاش کوئی ایسی صورت نکلے جو ان دونوں
کے ساتھ راہ و رسم بڑھے ۔ مگر والدہ کی وجہ سے ہمت نہ ہوتی تھی کیونکہ
یہ دونوں ان کے ہی کمرے میں بیٹھ کر رازداری کی باتیں کرتی تھیں ۔
دوسری طرف صادق کو اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کا بھی خیال تھا ۔
جعفر جو صادق سے چھوٹا تھا اس کو پہلوانی کا شوق تھا ۔ لیکن شہریار
جو جعفر سے چھوٹا تھا صادق سے بھی دس قدم آگے تھا ۔ اس کی نگاہ
شروع سے شکیلہ پر تھی ۔ بلکہ وہ سب کے سامنے چھیڑ چھاڑ سے کبھی نہ چوکتا ۔
ایک ہی گھر ایک مرض کے دو مریض ہو گئے ۔ صادق کو اس کی
خبر بھی نہ تھی کہ شہریار کی نظر شکیلہ پر ہے ۔ لیکن شہریار تاڑ چکا تھا کہ اپنی
دال گلنی مشکل ہے ۔ یہ سوچ کر اُس نے اپنی توجہ نسرین کی طرف کر دی ۔
نسرین کو حاصل کرنا آسان کام نہ تھا ۔ اس کے لئے بھی شکیلہ کی ضرورت
پڑتی تھی ۔ مگر شہریار کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ شکیلہ سے نسرین کے بارے
میں کچھ کہے ۔ کیونکہ بڑے بھائی صادق کا خوف تھا ۔ پھر وہ یہ بھی خیال کرتا
تھا کہ شکیلہ والدہ سے نہ کہہ دے ۔ اور جب نواب صاحب کا خیال آجاتا
تو تمام ارمانوں پر پانی پھر جاتا تھا ۔ اسی شش و پنج میں کئی روز بیت گئے ۔
آخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک روز جبکہ گھر میں سناٹا تھا شکیلہ کو اپنے
پاس بلا کر کہا ۔
شکیلہ ایک کام کرو گی ۔

ضرور کیوں نہیں   آپ کی خادمہ ہوں۔

ارے بھاڑ میں جائیں آقا اور خادم۔

اس سے کیا ہو گا؟

خس کم جہاں پاک   بڑے کام کا انجام بھی بُرا ہوتا ہے

مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔ اور تم پر کوئی مشقت بھی نہ ہو گی اور نہ کوئی خطرہ یا نقصان۔ اگر چاہو تو تمھارے لئے مشکل بھی نہیں۔

شکیلہ نے جھجکتے ہوئے، کمزور آواز میں جواب دیا۔

چھوٹے بابو کام تو بتاؤ۔ اگر کر سکتی ہوں تو ضرور کروں گی۔

شکیلہ پہلے وعدہ کرو۔ کرو گی بھی۔

اتنی بات سن کر شکیلہ کا خیال اپنی طرف گیا .... کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ نزلہ مجھ پر ہی گرے۔ اگر ایسا ہے تو یہاں رہنا مناسب نہیں۔ ان کا تو کچھ نہ بگڑے گا۔ سننے والے مجھ غریب ہی پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اس سے پہلے نواب صاحب ہی کو کیا سزا مل گئی۔

شہریار نے دیکھا کہ والدہ سامنے سے آرہی ہیں۔ بات پلٹتے ہوئے بولا۔

دیکھو جی اگر یہاں رہنا ہے تو ٹھیک رہو۔ ورنہ راستہ پکڑو۔

شکیلہ نے بھی منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

چھوٹے بابو جس طرح آپ فرمائیں گے کروں گی۔ اب کی بار معاف کرو۔ اس کے بعد شکایت کا موقعہ نہ ملے۔

بالکل نہیں۔
جاؤ دور ہوجاؤ۔
شکیلہ اتنا سن کر چلی گئی۔ اس کے بعد شہریار کی والدہ جو باہر کھڑی یہ مقدمہ سن رہی تھیں اندر داخل ہوئیں۔ انھوں نے ناک پر انگلی رکھتے ہوئے شہریار کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔
بیٹا شکیلہ سے کیا قصور ہوا جو اس قدر ناراض ہو رہے تھے۔ اگر کوئی غلطی ہو گئی تھی تو اس کو نظر انداز کر دینے۔ انسان ہی تو ہے۔ تمام دن مشین کی طرح کام کرتی رہتی ہے۔ آئندہ احتیاط رکھنا۔
شہریار نے کچھ تامل کر کے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔
امی آپ بھی مجھے ہی کہہ رہی ہیں۔
پھر کس کو کہوں؟
شکیلہ کو —— اگر اس سے بھول ہوتی ہے تو میرے کام ہیں۔ اگر صفائی نہیں ہوتی تو صرف کمرے کی۔ بھائی جان کا کمرہ کیوں نہیں بھولتی۔ وہ یقیناً جان کر چھوڑ دیتی ہے۔
والدہ نے کمرہ چاروں طرف دیکھ کر کہا۔
یہاں کونسی گندگی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ تمام وہم ہے اور کچھ نہیں۔
میں صحیح کہتا ہوں۔ دیکھو تمام گرد چڑھی ہوئی ہے —— دیکھو۔
شہریار نے میز پر انگلی پھیر کر کہا۔
چلو میں صاف کر دوں گی۔ ناراض ہونے کی ضرورت نہیں —— خدا معلوم

دلہن کو کیسے جینے دوگے۔

میں شادی ہی کب کروں گا؟

تو کیا کنوارے ہی رہنے کا ارادہ ہے؟

بالکل۔

نام و نشان کیسے چلے گا؟

اللہ کا شکر ہے دو بھائی موجود ہیں۔ میری حکومت بھاوجوں پر چلے گی۔ جدھر حسن و جمال دیکھوں گا وہیں تسیم کر دوں گا۔

جعفر یہ گفتگو سنتا ہوا گھر میں داخل ہوا ——— اور کہنا شروع کر دیا۔

جتنا چھوٹا اتنا ہی کھوٹا ——— امّی کو خوب بہلایا جا رہا ہے۔

شہریار سمجھ گیا کہ بھائی جان جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اپنے اوپر پڑ رہی ہیں۔ وہ کب چوکنے والا تھا۔ اسی طرح بغیر مخاطب ہوئے جواباً بولا۔

اس میں کیا شک ہے ——— امّی میری اور میں امّی کا۔

جعفر نے یہ سن کر کہا

غلط بالکل غلط ——— امّی صرف میری ہیں۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

بات یہیں تک پہنچی تھی کہ صادق بھی آ دھمکا ——— صحن میں کھڑے ہو کر بولا۔

یہ لڑائی کیوں ہو رہی ہے؟

والدہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگیں تو صادق ان سے مخاطب ہو کر بولا۔

امّی آپ کے ہوتے ہوئے بھی یہ طوفانِ بدتمیزی برپا ہے۔
بیٹا آپس میں باتیں ہو رہی ہیں۔ خدا نہ خواستہ لڑائی کیوں ہوتی۔
ایک کہتا ہے امّی میری ہیں۔ دوسرا کہہ رہا ہے امّی صرف میری ہیں۔
یہ سنکر بما دنی مسکرانے لگا۔
بس اتنی سی بات ہے۔
یہی ہے۔
اگر مانو تو میں فیصلہ کر دوں؟
شہریار اور جعفر دونوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔
آپ کا فیصلہ منظور کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔
اس میں ڈر کی کیا بات ہے؟
شہریار بچپن ہی سے حاضر جواب تھا، فوراً بول اُٹھا۔
آپ درست فرماتے ہیں۔ ڈر یہ ہے کہ شاید ایسا فیصلہ کریں جیسا کہ بندر نے کیا تھا۔ جبکہ دو بلّیاں ایک روٹی کی بانٹ پر لڑ رہی تھیں۔ اتفاق سے ایک بھوکا بندر وہاں آ دھمکا۔ بلّیوں نے اس کو دیکھتے ہی اپنی لڑائی کے فیصلے کی درخواست کر دی۔ بندر کی دلی مراد پوری ہوئی۔ فوراً اقرار کر لیا۔ ذرا سی بھاگ دوڑ میں ترازو بھی مہیّا کر لی۔ روٹی کے دو ٹکڑے اس طرح کیئے کہ ایک چھوٹا دوسرا بڑا۔ دونوں کو ترازو میں رکھ کر تولا تو ایک پلڑا بھاری ہوا۔ فوراً اس میں سے اتنا بڑا ٹکڑا توڑ کر اپنے منہ میں رکھ لیا کہ دوسرا ٹکڑا بھاری ہو گیا۔ اسی طرح کرتے کرتے پوری روٹی چٹ

کرگیا۔ اور بلّیاں دیکھتی کی دیکھتی رہ گئیں۔

صادق نے بڑی لاپرواہی سے پوچھا۔

تمہاری عقل کیا کہتی ہے جعفر؟

جی بھائی جان!

تمہارا کیا خیال ہے؟

شہریار کی رائے سے اتفاق ہے۔

کیا تم دونوں پہلے ہی سے ذہن نشین کر چکے ہو کہ میں اپنے حق میں فیصلہ دونگا۔

شہریار اور جعفر شرمندہ ہوگئے۔

بولتے کیوں نہیں؟

دونوں ایک زبان ہو کر بولے۔

جی یہی خیال ہے۔

صادق نے قہقہہ لگایا۔ جب یہ سمجھتے ہو تو لڑتے کیوں ہو؟

شہریار اور جعفر بلیوں کی طرح شرمندہ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

تینوں بھائیوں کی باتیں سنکر شکیلہ اور صادق کی والدہ کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ رہے تھے۔

چوتھا باب

کوشش کرنا انسان کا کام ہے، اس کو پورا کرنا یا نہ کرنا قدرت کا کام ہے۔ اچھائی اور برائی دونوں سامنے ہوتی ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان غلطی خود کرتا ہے اور ناکامی یا نقصان کی صورت میں تمام الزام قدرت کے سر تھوپ دیتا ہے۔ جو لوگ محنت کو زندگی کا جزو بنا لیتے ہیں، اور ناکامی اور مشکلات سے ہمت ہار کر نہیں بیٹھتے وہ کامیاب ضرور ہوتے ہیں۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ خود تو کچھ کرتے نہیں۔ لیکن کامیاب لوگوں کو دیکھ دیکھ کر حسد کرتے ہیں۔ اور ان پر طرح طرح کے الزامات لگایا کرتے ہیں۔ اور غلطیوں کو تلاش کیا کرتے ہیں۔

ان ہی حالات سے افضل بیگ کو بھی دوچار ہونا پڑا۔ وہ دن رات اپنی ترقی کے لئے کوشاں رہتا۔ اپنی ڈیوٹی کے اوقات کے علاوہ وہ بھی کام

کرتا۔ اس نے جس کام کو پکڑا پورا کرکے چھوڑا۔ وہ اپنے کام پر اتنا حاوی ہوگیا کہ بڑے بڑے افسر بھی اس سے مشورہ لینے لگے۔ اُس ذہانت اور کارکردگی کے نتیجے میں پورا محکمہ اس کے گن گانے لگا۔ افسروں نے اس کی سفارشیں کیں۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس کو جنرل پوسٹ ماسٹر کا عہدہ مل گیا۔ افضل بیگ پہلا ہندوستانی تھا جو اتنے جلیل القدر عہدہ پر پہونچا

اُس کی اس ترقی کو دیکھ کر بعض ہندوستانی ساتھیوں کے دل میں حسد کی آگ بھڑک گئی۔ یہ لوگ اس کے منہ پر تو خوشامد کرتے لیکن دل میں اس کو نقصان پہونچانے کی فکر میں رہتے۔ بہت سے جال ڈالتے لیکن ناکام رہتے۔ آخرکار توڑ جوڑ کرکے افضل بیگ کے ایک خاص دوست سردار مرزا کو اپنا ہم خیال کرکے اپنی پارٹی کا لیڈر بنا لیا۔

سردار مرزا بظاہر افضل بیگ کی رفاقت کا دم بھرتا لیکن اندر ہی اندر اس کی کمزوریوں کو ٹٹولتا رہتا۔ اور اپنی دن بھر کی کارگزاری کی رپورٹ پارٹی کو دیتا۔ اب سردار مرزا افضل کی کوٹھی پر پابندی سے جانے لگا۔ نوکروں کی کیا مجال تھی کہ وہ صاحب کے خاص دوست کو منع کرتے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ افضل بیگ کی غیر موجودگی میں ان کی ڈاک بھی پڑھ لیتا تھا۔ یوں تو افضل کو سردار مرزا پر اتنا اعتماد تھا کہ اپنا رازدار بنا لیا تھا،

اسی طرح کافی دن گزر گئے۔ ایک روز موقعہ پاکر سردار نے پوچھ ہی لیا ارے بھائی یہ شکیلہ اور نسرین کا کیا جھگڑا ہے۔ بیچاری کافی پریشان معلوم ہوتی ہیں۔ شاید پرانا مرض پڑ گیا ہے۔ تمھاری دوا موافق آتی ہوگی۔

اسی لیئے ڈاک پر ڈاک چلی آرہی ہے ـــــــ یہی بات ہے نا ؟

افضل خاموش رہا ـــــــ کیونکہ اُس نے نہ تو شکیلہ کو دیکھا تھا اور نہ ہی نسرین کو۔ پھر اُن کے بارے میں کیا بتا سکتا تھا ـــــــ سردار نے تھوڑی دیر جواب کا انتظار کرنے کے بعد افضل کا شانہ ہلاتے ہوئے کہا۔

کس سوچ میں پڑ گئے ہو ؟

افضل بیگ نے ایک لمبا سانس لیا۔

سوچنا کس بات کا ؟ ـــــــ جناب نے جو کچھ فرمایا بالکل غلط ہے۔ میں اس قسم کا آدمی نہیں۔

یہ تو جان چھڑانے کی بات ہے۔ ایسی باتوں کو کون بتا سکتا ہے۔

سردار بھائی میری تمام باتوں کا آپ کو علم ہے۔

لیکن اس ڈاک بازی کا نہیں۔

یہ سنکر افضل کی تیوری میں بل پڑ گئے۔ کیونکہ سردار کو اس کی صفائی پر بھی یقین نہ آیا تھا۔ سردار نے بھی افضل کی اس ناراضگی کا کوئی اثر نہ لیا اور برابر اپنی ہی ہانکتا رہا۔ یہاں تک افضل نے جلدی سے دوڑ کر کونے میں رکھے ہوئے ایک صندوق کو کھول کر ایک رجسٹر جس میں وہ تمام خطوط جو شکیلہ نے افضل کے نام بھیجے تھے، اور وہ جوابات جو افضل نے شکیلہ کو دئے تھے ترتیب وار لگے ہوئے تھے۔ سردار نے تمام خطوط اور جوابات کو بغور خاموشی کے ساتھ پڑھا۔ اور باہر چلا گیا۔ افضل بیگ نے اب اس کی رائے معلوم کرنے کے لئے کئی آوازیں بھی دیں۔ مگر سردار نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

سردار کے اس طرح چلے جانے سے افضل کو بہت ملال ہوا۔ کیونکہ اس کو مطمئن کرنے کی جو صورت ہوسکتی تھی وہی اختیار کر دی تھی۔ اس شہر میں اس کا دوست اور راز دار سردار ہی تھا۔ اس کا زیادہ وقت سردار کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ افضل نے کئی بار سوچا کہ اُس کو منایا جائے۔ مگر ناراضگی کا اصل معلوم نہ ہوا۔

ادھر سردار نے یہاں جو کچھ ڈرامہ کھیلا تھا اس کی تمام رپورٹ اپنی پارٹی کو سنا دی۔ پارٹی کے تمام ممبروں نے خوب دماغی گھوڑے دوڑائے ہر ایک نے اپنی اپنی رائے پیش کی۔ پھر باتفاق ایک پروگرام تیار کر لیا۔

پروگرام تیار کرنے کے بعد ان لوگوں نے کچھ دوسرے لوگوں کو افضل کی کوٹھی پر بھیجنا شروع کیا۔ ہر شخص نے الگ الگ طریقے سے وہاں سردار کو معلوم کیا۔ لیکن سردار کو وہاں نہ پاکر مایوسانہ انداز میں واپس آیا۔ افضل بیچارہ آج اس ڈرامے کا کافی اثر لے رہا تھا۔

کئی روز گزر گئے۔ سردار کے انتظار میں اس کی آنکھیں دروازے پر لگی رہتیں۔ آخر میں مایوس ہوکر سردار سے صلح کی تدبیر سوچنے لگتا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آتا تو دوسرے کام میں لگ جاتا۔

مجبوراً افضل نے دل بہلانے کی ایک یہی راہ نکالی کہ شکیلہ کو خط لکھا کہ تم نسرین کو لے کر فوراً چلی آؤ۔ اور اپنی روانگی سے مجھے اطلاع دینا تاکہ میں شہر کے باہر تم سے مل سکوں۔ لفافہ بند کر کے نوکر کو دیا۔ جوں ہی وہ لفافہ لے کر کوٹھی سے باہر نکلا تو سردار ٹہلتا ہوا مل گیا۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد سردار نے پوچھا

میاں جمالو کہاں جا رہے ہو؟

بے چارے نے صاحب کا دوست سمجھ کر جواب صحیح دیا۔ بس پھر کیا تھا، سردار نے وہ لفافہ اس سے حاصل کرنے کے لئے ایسی باتیں بنائیں کہ جمالو نے اس کے سپرد کر دیا۔ وہ لفافہ لیکر فوراً رفو چکّر ہو گیا۔

جمالو کوٹھی میں واپس آگیا۔ افضل نے پوچھا تو اُس نے دیا

جی، لفافہ لیٹر بکس میں ڈال آیا ہوں۔

افضل کو شکیلہ اور نسرین کی آمد کا انتظار شروع ہو گیا۔ دل میں بے چینی سی لگ گئی ——— ہر وقت یہی خیال رہنے لگا ——— نہ معلوم کیسی شکل و صورت ہو گی۔ نواب صاحب کی لڑکی ہے۔ اولاد تو ماں باپ کی شباہت پر ہوتی ہے۔ نواب صاحب خود کیا معمولی ہیں نسرین لڑکی ہونے کی وجہ سے ان سے بھی زیادہ حسین ہو گی۔ وہ غیر تمند ہے۔ ماں باپ نے اگر منگنی ختم کر دی تو وہ اپنا معاملہ خود اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی ہے۔ عورت اپنی زندگی میں ایک بار ہی محبت کیا کرتی ہے۔ منگنی ختم ہونے پر نہ معلوم اُس کے دل پر کیا بیتی ہو گی۔ یہ تو وہی جانتی ہے۔ یہ سب کیفیت اُس کے آنے پر معلوم ہو جائے گی۔ اس کی محبت قابلِ قدر ہے۔ مجھے اس کی محبت کا جواب محبت سے دینا چاہیئے۔ وہ بلا کسی شرط کے خود کو میرے حوالے کر رہی ہے۔ میں بھی اُس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھوں گا۔ اور اُس کو ذرا بھی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ وہ میرے دُکھ درد میں کام آئے گی۔ وہ میری زندگی بھر کی ساتھی ہو گی۔

بس وہ اب جلد آجائے۔ نکاح کی تقریب میں بڑے بڑے افسروں کو شرکت کی دعوت دوں گا۔ میں بھی نسرین کی طرح اپنی شریک حیات بنانے کا معاملہ اپنی مرضی سے طے کروں گا۔ اس معاملہ کی خبر ماں باپ کو نہ ہونے دوں گا۔ اس کی خبر جب وہ سنیں گے تو ان پر سکتے کی سی حالت طاری ہو جائے گی۔ ان کو مجھ پر غصّہ بھی بےحد آئے گا۔ لیکن وہ غصّہ اُن کو برداشت کرنا ہوگا۔

ادھر افضل یہ خیالی محل بنا رہا تھا۔ اُدھر سردار نے ایک جعلی خط لکھکر لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ خط پر اپنا پتہ تحریر کیا۔ اور افضل بیگ کا لفافہ اپنے پاس محفوظ کر لیا۔ کوئی پندرہ روز بعد نسرین نے جواب دیا کہ میں آج سے چار روز بعد لکھنؤ پہنچ رہی ہوں۔ خط میں نسرین نے شناخت کے لئے یہ بھی لکھدیا تھا کہ میرے غرارے کا رنگ آسمانی ہوگا۔ آپ شہر سے باہر سڑک پر ملیں۔

خط کو پاکر سردار پھولے نہ سماتا تھا۔ وہ افضل بیگ کے خلاف ہر بات کی رپورٹ اپنی پارٹی کو دیتا تھا، لیکن اس سازش کا علم کسی کو نہ ہونے دیا۔

مقررہ دن سردار شہر سے باہر سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر انتظار کے بعد اُس نے دیکھا کہ دور سے سڑک پر گرد اُڑ رہی ہے۔ دل میں سوچا کہ نسرین کی سواری یقیناً یہی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس گرد میں سے ایک رتھ نمودار ہوا۔ جو بہت تیزی سے شہر کی طرف آرہا تھا۔ جب رتھ قریب آیا تو سردار نے آگے بڑھ کر روک دیا۔ رتھ بان نے فوراً رتھ روک لیا۔ نسرین پردے کے اندر سے جھانک کر دیکھا۔ مگر وہ افضل بیگ کو کیا پہچان سکتی تھی۔

اس لئے کہ افضل کو اس نے کبھی نہ دیکھا تھا اور نہ ہی افضل نے نسرین کو۔ خط کے ذریعے سے دونوں ہمراز ہو چکے تھے۔ اگرچہ صورت آشنائی نہ ہوئی تھی۔ لیکن وہ جھجک جو اجنبیت میں ہوتی ہے ختم ہو چکی تھی۔ اسی لئے بے تکلفی سے سردار نے رتھ بان سے پوچھا۔

کیا اس رتھ میں نواب صاحب کی صاحبزادی ہیں ؟

رتھ بان ابھی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ پردے سے آواز آئی۔

میں نسرین ہوں، نواب صاحب کی لڑکی ...... آپ کا اسم شریف ؟

سردار مسکرانے لگا۔ ایک منٹ توقف کے بعد بولا

میرا یہاں پر موجود ہونا ہی تمہارے سوال کا جواب ہے۔

نسرین نے افضل بیگ سمجھ کر مطمئن ہوتے ہوئے۔ رتھ بان سے سردار کو بٹھانے کے لئے کہا۔ رتھ بان نے رتھ میں بٹھا لیا۔ سردار راستہ بتانے لگا۔ رتھ سردار کے مکان پر پہنچ گیا۔ نسرین رتھ میں اتر کر مکان میں داخل ہوئی۔ سردار نے رتھ بان کو کرایہ کے علاوہ کچھ انعام بھی دیکر رخصت کیا۔ اور پھر مکان میں داخل ہو کر دروازے کے کواڑ بند کر کے زنجیر لگا کر نسرین کے پاس پہونچا۔ ابھی تک نسرین منہ پر نقاب ڈالے کھڑی تھی۔ نسرین پر للچائی نظریں ڈالتے ہوئے بولا۔

ارے، نسرین کیا سوچ رہی ہو۔

کچھ نہیں۔

منزلِ مقصود پر پہنچ گئی ہو۔ اب یہ نقاب بازی ختم کرو۔ اتنا بڑا سفر کرکے آئی ہو۔ بہت تکان ہوگئی ہوگی۔ آرام کرنا چاہیئے۔

آپ کو پاکر تھکن دور ہوگئی۔ اگر خدانخواستہ آپ نہ ملتے تو۔۔۔

بڑی تکلیف ہوتی۔ مگر یہ کیسے ہوسکتا تھا۔

آپ کا بہت بہت شکریہ۔

شکریہ کس بات کا؟

ذرہ نوازی کا۔

یہ آپ کہہ سکتی ہیں۔ میرے لئے تو کوہِ نور سے بھی بڑھ کر ہو۔ یہ باتیں تو پھر بھی ہوسکتی ہیں۔ کمرے میں چلو۔ اور سامان بھی اندر رکھ دو۔

نسرین اپنا سامان جو ایک نہایت خوبصورت مخملی چادر میں بندھا ہوا تھا اٹھا کر کمرے میں لے گئی۔ سردار نے خادمہ کو آواز دے کر پوچھا

زہرہ غسل کے لئے پانی گرم کیا؟

جی میاں۔۔۔۔ ابھی کئے دیتے ہوں۔

جلدی کرو ——— اور پھر آہستہ سے زہرہ کے کان میں کہا، نسرین کے سامنے افضل میاں میرا نام ظاہر کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ میرے بارے میں دریافت کریں اور تم یہ کہدو کہ افضل میرا دوست ہے۔

زہرہ بھی بڑی چالاک تھی۔ فوراً بھانپ گئی کہ سردار میاں نے نسرین کو بڑا دھوکہ دے کر اپنے جال میں پھنسایا ہے۔ اُس نے سردار کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

بھلا میاں ایسا ہوسکتا ہے کہ آپ کے حکم سے باہر جاؤں۔ جب تک معلوم نہ تھا غلطی ہو سکتی تھی۔ لیکن اب تو آپ نے بتا ہی دیا ہے۔

زہرہ کی یہ بات سن کر سردار مسکرایا۔

بڑی تیز ہے۔

آپ کی دعا ہے۔ مگر صرف باتوں ہی سے کام نہ نکالیے۔ کچھ غریبوں کا بھی خیال رکھئے گا۔

مجھے تیرا خیال ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں۔

مجھے بھی یہی امید ہے۔

سردار یہ باتیں سمجھانے کے بعد دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ نسرین نے اپنا برقعہ اتارا اور باورچی خانے میں زہرہ کے پاس چلی گئی۔ اُس نے اپنے دوپٹہ سے گھونگٹ کر رکھا تھا۔ زہرہ یہ دیکھ کر مسکرائی۔ نسرین کچھ جھینپ سی گئی۔ اس کو خیال ہوا کہ افضل نے شاید تمام داستان اس کو سنا دیا ہے۔ لیکن یہ اب انہی لوگوں کے قبضہ میں تھی کیا کر سکتی تھی۔ کچھ دیر تک سکوت رہنے کے بعد ہمت کر کے زہرہ سے پوچھا۔

بیگم صاحب! آپ یہ پردہ کس سے کر رہی ہیں؟

نسرین نے کوئی جواب نہ دیا۔ سوچنے لگی کیا جواب دوں۔ کوئی جواب سمجھ میں نہ آیا۔ زہرہ جواب کے لیے نسرین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل میں بھی طرح طرح کے خیال آرہے تھے۔ وہ اپنی جوانی کی طرف خیال کرتے ہوئے سوچنے لگی کہ نسرین کی پھول سی زندگی کو سردار کے ہاتھوں تباہی سے

سے بچانا چاہیئے۔ لیکن دولت کے لالچ نے ایسا کرنے سے روک دیا۔ اور گردن جھکاتے ہوئے پھر بولی۔

بیگم کیا سوچ رہی ہو ؟

کچھ نہیں۔ یوں ہی کچھ خیال آگیا تھا۔

کس بات کا ؟ ——————— اور ہاں گھونگھٹ تو ہٹاؤ۔

شرما شرمائی نسرین نے دوپٹہ ذرا اوپر کو سرکایا۔ لیکن زہرہ کو اس پر بھی چین نہ آئی۔ فوراً کھڑے ہوکر نسرین کا دوپٹہ کھینچ لیا۔ وہ غریب دوپٹہ کو تھامتی رہ گئی۔ مگر کچھ نہ کرسکی۔ اور ایک طرف کونے میں سکڑ کر رہ گئی۔ نسرین اور زہرہ کی اس ہاتھا پائی کو سردار بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ باہر آکر بولا

زہرہ یہ کیا ہو رہا ہے ؟

اتنا کہہ کر ساتھ ہی ساتھ زہرہ کی طرف آنکھ ماردی کہ وہ کوئی خیال نہ کرے۔ اشارہ پاتے ہی زہرہ مطلب سمجھ گئی۔ منہ بناتے ہوئے بولی۔

میاں کچھ نہیں۔

میں تمھاری سب حرکتیں دیکھ رہا ہوں۔ پانی گرم ہونے میں کیا دیر ہے۔

ابھی ہوا جاتا ہے۔

سردار باہر چلا گیا۔ زہرہ نے دروازے کے کواڑ بند کر دئے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس گھر میں کئی سال بعد یہ دو عورتیں نظر آرہی تھیں۔ ورنہ اب تک مردانہ بیٹھک بنا ہوا تھا۔ وقت مقررہ پر آنے والے دوست احباب آنے شروع ہوگئے۔ دروازہ اندر سے بند دیکھ کر تعجب کرنے لگے۔ بار بار زنجیر کھٹکھٹائی

پھر بھی دروازہ نہ کھلا۔ کیونکہ سردار ان تمام باتوں سے زہرہ کو آگاہ کر چکا تھا۔ انہی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے زہرہ نے اندر ہی سے جواب دیدیا کہ

میاں باہر گئے ہوئے ہیں ——— گھر میں پردہ ہے۔

آنے والے خاموش ہو کر واپس چلے گئے۔ مگر بعض جو چالاک اور نہایت بے تکلف تھے تاک جھانک میں مصروف ہو گئے۔ بہت کوشش کے بعد زہرہ کو دیکھ سکے۔ نسرین چونکہ ایک کونے میں بیٹھی تھی وہ نظر نہ آئی۔ لیکن وہ زہرہ ہی کو دیکھ کر جھومنے لگے۔ وہ آپس میں اسی کے حسن کی تعریف کر رہے تھے اور قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں کہ سردار بھی آ پہنچا۔ چونکہ یہ بھی بہت ہوشیار تھا ان لوگوں کی باتیں سننے کے لئے دبے پاؤں اوٹ میں ہوتا ہوا ان لوگوں کے نزدیک آگیا۔ کچھ توقف کے بعد اُن کے پاس پہنچکر ایک ساتھی کی گردن پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔

یہ حرکت بہت بُری ہے۔ تم کو شرم آنی چاہیئے۔ اس گھر میں نشانہ بازی نہیں ہو سکے گی۔ تم نے میرا ذرا بھی خیال نہ کیا۔ مجھے اب تمہارے متعلق سنجیدگی سے سوچنا پڑے گا کہ آئندہ ربط قائم رکھا جائے یا نہیں۔

اس وقت سردار مرزا کا چہرہ غصے میں تمتما رہا تھا۔ اور آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ تمام جسم بید کی طرح تھرتھرا رہا تھا۔ وہ ان دوستوں سے تعلقات کیا بلکہ کسی قیمت پر بھی نسرین کا راز کسی پر بھی کھولنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک سونے کی چڑیا اُس کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ نسرین ایک نہایت ہی حسین دوشیزہ تھی۔ سو دو سو کیا ہزار دو ہزار میں بھی اس کا جواب ملنا ناممکن تھا۔

ایسی صورت میں بھلا وہ کیسے گوارا کرتا کہ نسرین کسی اور کے لئے بھی دل لگی کا سبب بن سکے۔ لیکن سردار کو یہ خیال نہ رہا کہ زہرہ کو یہ تمام راز معلوم ہے۔ اس وقت جو کچھ منہ میں آیا کہہ ڈالا۔

سردار کے چلانے کی آوازیں سن کر زہرہ بھی مکان کے دروازے میں آکر کھڑی ہوگئی۔ شروع سے آخر تک تمام باتوں کو غور سے سنا۔ ادھر نسرین نے جو دروازے پر زہرہ کو اس طرح کھڑے دیکھا تو دل میں شک ہوا۔ سوچنے لگی کہ میرے گھر والے پتہ لگا کر یہاں آگئے۔ یہ جھگڑا افضل کے ساتھ شاید میری ہی وجہ سے ہو رہا ہے۔ سننے کے لئے لرزتی کانپتی خود بھی زہرہ کے پاس آکر کھڑی ہوگئی۔ اور دروازے کی ریخوں میں سے دیکھنے لگی۔

نسرین ایک دم پریشان ہوگئی جب کہ اس نے دیکھا کہ اسی شخص کو لوگ سردار کہہ رہے جس نے اب تک خود کو افضل ظاہر کر رکھا تھا۔ وہ اس کو اپنے لئے ایک جال ساز سمجھ گئی۔ اس وقت اس کی حالت عجیب تھی۔ اس کا دماغ چکرا گیا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ لیکن وہ اصل حقیقت کو کیسے معلوم کرے۔ ایک شکار کی مانند شکاری کے جال میں پھنس چکی تھی۔ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ اس کے گلاب کے مانند چہرے کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ زہرہ نے جوں ہی اس کی یہ حالت دیکھی تو بہانہ بنا کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ اندر لے گئی۔ نسرین کی حالت بدستور دیکھ کر پوچھنے لگی۔

بیگم کیا سوچ رہی ہو؟

نسرین بجائے جواب دینے کے زار زار رونے لگی۔ زہرہ بھی ہڑبڑا گئی۔

اُس نے نسرین کا سر اپنے کاندھے پر رکھ کر آنسو پونچھنے شروع کر دئے۔ جوں جوں زہرہ سر پر ہاتھ پھیر کر ہمدردی اور پیار ظاہر کرتی تھی اُس کا دل اور بھی بھر بھر آتا۔ یہاں تک کہ اُس کی ہچکی بندھ گئی ——— زہرہ کو بھی اس وقت اپنا کوئی واقعہ یاد آگیا۔ اور نسرین کی کیفیت میں شریک ہوگئی۔ وہاں کوئی تیسرا آدمی ایسا نہ تھا جو ان کو دلاسا دیتا اور خاموش کرتا۔ سردار ان لوگوں سے فارغ ہوکر گھر میں آیا، نسرین اور زہرہ کو روتا ہوا دیکھ کر پریشان ہوا۔ سوچا کہ اپنے سب گھر والوں سے ایک دم جدا ہو کر آئی ہے وہ شاید یاد آرہے ہوں گے۔ لیکن اس زہرہ کمبخت کو کیا ہوا جو خواہ مخواہ ٹسوے بہا رہی۔ وہ عورت کی نفسیات کو کیا سمجھتا۔ بلکہ اور غضبناک ہوگیا۔ جونہی زہرہ کی نظر سردار پر پڑی فوراً رونا بھول گئی، اور نسرین کو چھوڑ کر الگ ہوگئی۔ سردار مرزا خونی بھیڑیئے کی طرح زہرہ پر لپکا۔

تجھے شرم نہیں آتی۔ مہمان کے گھر میں آتے ہی رونا پڑ گیا۔ بڑے بوڑھوں نے صحیح کہا ہے ——— کمین کو کبھی منہ نہ لگانا چاہیئے۔ گیہوں کی پہلی بار ملی ہے۔ در در کی ٹھوکریں کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ کان کھول کر سن لے آئندہ کوئی شکایت نہ سنوں۔ ورنہ اچھا نہ ہوگا۔

سردار نسرین کا ہاتھ پکڑ کر والان میں چلا گیا۔ اس وقت نسرین کی عجیب کیفیت تھی۔ تمام جسم پر لرزہ طاری تھا۔ اُس کے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ کسی غیر شخص کا ہاتھ اُس کے جسم کو لگا۔ یہ اور بات تھی کہ وہ گھر سے نکل آئی، مجبوراً سردار کی یہ حرکت برداشت کی۔ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ والان کے

اندر جاکر سردار سے کچھ فاصلے پر پیٹھ موڑ کر بیٹھ گئی۔ سردار اس وقت بے
سے کھانا تیار ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ کیونکہ اس کے بعد وہ زہرہ کو
دیتا ـــــــــ سردار نے سخت تقاضا کر کے جلدی جلدی کھ
تیار کرایا، اس کے بعد زہرہ کو کچھ دے کر رخصت کر دیا۔

اب میدان صاف ہو گیا۔ سردار نے اطمینان کا سانس لیتے ہو
چاروں طرف دیکھتے ہوئے مکان کا دروازہ بند کر دیا۔ نسرین خام
بیٹھی دیکھتی رہی۔ لیکن خوف کے مارے دل دھڑک رہا تھا۔ جس وقت
زہرہ موجود رہی اُس کو اطمینان رہا۔ اُس کا یہ خیال بڑھتا چلا گیا کہ جہاں
بیٹھی ہوں یہ افضل کا مکان نہیں، اور نہ ہی یہ شخص افضل ہے۔ یہ شُبہ ا
وقت دور ہو سکتا ہے کہ کوئی اس کا اطمینان دلائے کہ یہ واقعی افضل
لیکن نسرین نے ہمت نہ ہاری، اس نے یہ سوچتے ہوئے کہ جس کے لئے
آج اس حالت کو پہونچی ہوں اگر وہ نہ ملا تو زندگی بیکار ہے۔ کچھ بھی ہو
افضل کے سوا کسی اور کو شریکِ زندگی نہیں بناؤں گی۔

سردار نے دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا۔ پھر نسرین کو آواز دی۔ اُ
اِس وقت یہی مناسب سمجھا کہ بجائے ناراضگی اور غصّے کی بجائے مصلحت سے کا
لینا چاہیئے۔ فوراً کھڑی ہو گئی۔ وہ گھونگھٹ جو نقاب کا کام دے رہا تھا
دیا ـــــــــ چاند بدلی سے نکل آیا۔ سردار کی نظریں نسرین کے
چہرے پر جو بھی پڑیں گڑ کر رہ گئیں۔ بلکہ خود سردار پر مدہوشی طاری ہو گئی
اور عالمِ محویت میں کھو کر رہ گیا۔

وہ ایک جوانی کو چھوڑ کر اپنا آرام کھو چکا تھا۔ دسترخوان پر چنا ہوا کھانا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ نسرین شرمائی ہوئی لگا ہوں سے اس ڈرامے کو دیکھ رہی تھی لیکن اتنی ہمت کہاں سے لاتی کہ سردار سے کہہ دیتی ـــــ کھانا کھا لو اور ایسے وقت میں سردار کا خیال ادھر کب آ سکتا تھا۔ اس کے ہوش و حواس بھوک اور پیاس نسرین کی مست بھری آنکھوں اور ہوش ربا چہرے اور قد موزوں کی نذر ہو چکے تھے ـــــــ کافی دیر تک انتظار کر کے مجبوراً نسرین نے گردن اوپر اٹھا کر سردار کی طرف مخاطب ہوئی دونوں کی نظریں باہم ٹکرائیں۔ سردار نے سکوت کو توڑنے کے لئے خود ہی مسکرائی تاکہ کچھ بولے ـــــــ نسرین کی تدبیر کامیاب ہوئی۔ سردار نے لمبا سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

نسرین یہ ہنسی کیسی ؟

دسترخوان پر کھانا رکھا ہوا ٹھنڈا ہو گیا ہے۔

وہ صرف آپ ہی کے لئے ہے۔

آپ شرکت کیوں نہیں کرتے ؟

میں میزبان ہوں۔

ان باتوں کو چھوڑیئے۔ یہاں نہ کوئی میزبان ہے نہ مہمان۔

جی یہی چاہتا ہے کہ آپ کھائیں اور میں میزبانی کے فرض انجام دوں۔

ایسے تو مجھ سے ایک نوالہ بھی نہیں کھایا جائے گا۔

سردار کچھ سوچ کر بولا۔

اگر میری زندگی کی مالک نسرین کی یہی خواہش ہے تو پوری کروں گا مجھے پروا نہیں کہ میری خواہش پوری ہو۔

نسرین مسکرائی اور ادائے خاص سے دسترخوان پر بیٹھ گئی، دونوں نے کھانے پر ایک ساتھ ہاتھ بڑھایا۔ کھانے کے دوران میں سردار کی نظریں اس کے دلی جذبات کی ترجمانی کر رہی۔ بعض حرکات بےساختہ نسرین کو جواب دینے کے لئے مجبور کر رہی تھیں۔ پرلطف فقرہ بازی بھی ہو رہی تھی۔

کھانے سے فراغت کے بعد سردار نے داستانِ عشق کے اوراق پلٹنے شروع کر دئے۔ چونکہ افضل کی رازداری سے سردار پورا واقف تھا۔ نسرین کے بہت سے خطوط بھی پڑھ چکا تھا، اس لئے پہلے کی بہت سی باتیں جو افضل کو لکھی تھیں اس وقت سردار نے دوہرائیں۔ ان باتوں کے بعد نسرین کے دل میں جو شک پیدا ہو گیا تھا رفع ہو گیا۔ اور دل ہی دل میں خود کو شک پیدا ہونے کی بنا پر ملامت کرنے لگی۔ نسرین کو خاموش دیکھ کر سردار نے بیتاب ہو کر کہا۔

خیریت تو ہے نسرین؟

کچھ نہیں، کچھ خیال آگیا تھا۔

کس بات پر؟

بات یہ ہے کہ انسان کے دل میں ذرا سی بات پر شک آجاتا ہے، میں جس وقت آئی، اور آپ کو دروازے کے باہر لوگوں سے بات کرتے سنا تو بعض باتوں سے دل میں خیال آیا کہ آپ بناوٹی افضل ہیں۔ اور

یہاں سے چھٹکارا پانے کی ترکیبیں سوچنے لگی۔ لیکن اس وقت کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ میں غلطی پر تھی۔

سردار مسکرانے لگا۔

یہ بھی اچھا ہوا کہ جلد ہی صبح ہو گئی۔ ورنہ ....

یہ تو بتایئے کہ آپ کو سردار کے نام سے کیوں پکارتے ہیں؟

واقعی تم کو غلط فہمی ہونا یقینی تھا۔ میرا اصل میں پورا نام سردار افضل مرزا ہے۔ لیکن یہ شہری لوگ مختصر نام لینا پسند کرتے ہیں۔ اس لئے عام طور پر سب لوگ سردار ہی کہتے ہیں۔

نسرین نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا۔

بڑے خراب ہیں یہ لوگ جو پورا نام نہیں لیتے۔ ایسے شاندار نام کو بگاڑ کر معمولی نام بنا دیا ہے۔

ایسا نہ کہو نسرین۔

کیوں؟

اس لئے کہ اب تو تم بھی شہری ہو گئی۔ کچھ دن گزرنے پر تم بھی ایسی ہی بن جاؤ گی۔

خدا نہ کرے۔

رات کے دو بج گئے اور پھر تین۔ نسرین کی آنکھوں میں نیند کے خمار کا طوفان اُمڈ آیا۔ بار بار جماہی پر جماہی لے رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ سردار خود ہی سونے کے کہیں۔ مگر سردار کا شوق گفتگو بڑھتا جا رہا۔ بھلا یہ

مسرت آگیں لمحات نیند کی نذر کیسے کر دیتے۔ یہ قیمتی رات جو نہایت زبردست فریب کے بعد حاصل ہوئی تھی بھلا سو کر گزارنے کے تھوڑی ہی تھی۔ نسرین نیند کے ہاتھوں انتہائی مجبور ہو کر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔

سردار کچھ نہ کہہ سکا۔ ایک مجبور کی طرح دیکھتا رہ گیا —— نیند سو چکی تھی۔ مگر سردار اپنی جگہ بیٹھا ہوا اپنی محبوبہ کو برابر تک رہا تھا۔ بہت دیر تک یہی کیفیت رہی۔ آخر کار سردار کو نسرین کی مستانہ حالت نے بیخود کر دیا۔ اپنی جگہ سے جھومتا ہوا نشہ عشق میں سرشار ہو کر نسرین کی چارپائی کی طرف چند قدم ہی بڑھا تھا کہ اچانک سوتی ہوئی اچھل پڑی —— سردار کو اپنی طرف آتے دیکھ کر ایک دم چارپائی سے کود کر دور جا کر کھڑی ہو گئی۔

سردار دیکھتا رہ گیا —— لیکن منہ سے کچھ نہ کہہ سکا۔

پانچواں باب

زندگی بقول کسی کے بے چینی اور پریشانیوں کا نام ہے۔ انسان کو زندگی میں چین اور سکون نصیب نہیں ہوتا۔ کوئی نہ کوئی الجھن پڑی رہتی ہے۔ پوری عمر اسی طرح ختم ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی کہے کہ مرتے وقت مرنے والے کے دل میں کوئی آرزو نہ تھی بالکل غلط ہے۔ یہی حال شکیلہ کا بھی تھا۔ جذبۂ انتقام کے تحت نہ معلوم کتنے پروگرام بنا رکھے تھے۔ جن میں سے دو پورے ہوئے۔ پہلا یہ کہ نسرین کی منگنی ٹوٹ گئی۔ دوسرا یہ کہ نسرین کو اپنے گھر سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ ان دونوں حادثوں نے نواب صاحب کی نوابی کو خاک میں ملا دیا۔ لیکن شکیلہ کی پیاس اب بھی نہ بجھی۔ وہ شکیلہ کی جوانی کو اپنی آنکھوں سے برباد ہوتے دیکھنے کی آرزومند تھی۔ ابھی وہ اپنے دونوں نئے آقاؤں صادق و شہریار کو کالے ناگوں

کی طرح کھلانے میں مشغول تھی۔ عورت کیا کچھ نہیں کر سکتی۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ اپنی جگہ مضبوط رہے۔ شکیلہ نے اُن دونوں کے بارے میں جو کچھ چاہا پورا ہوا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔ صادق اور شہریار کے لئے اُس کے دل میں کوئی جگہ نہ تھی۔ بلکہ اب جلد از جلد لکھنؤ جانے کی لگی ہوئی تھی۔ صادق ہی شکیلہ کو فرار ہونے کی ترغیب دیتا تھا۔ مگر شرط یہ تھی کہ نسرین کو ضرور اپنے ساتھ لے جائے۔ یہ نسخہ اگرچہ صادق نے تجویز کیا تھا۔ مگر صادق کو کوئی فائدہ نہ پہونچا۔ مقصد اس سے نسرین کو حاصل کرنا تھا۔ وہی ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ مجبوراً شکیلہ پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ شکیلہ ایسی بھولی کہاں تھی جو آسانی قابو میں آجاتی۔

خیر، دن گزرتے رہے، ایک وقت میں شکیلہ نے دو دلوں میں الگ الگ آگ لگا دی تھی۔ یہ اتنی چالاک تھی کہ ان دونوں کو احساس تک بھی نہ ہونے دیا۔ وہ لفظ محبت کو ایک مہمل اور بے معنی سمجھتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ مرد اپنی نفسانی خواہشات اور ہوس کو پورا کرنے کے لئے اس کی آڑ لیتے۔ یعنی ہوس کا نام محبت اور عشق رکھ لیا ہے۔

یہی حالت صادق اور شہریار کی تھی۔ وہ جب بھی شکیلہ کو تنہا پاتے اُس سے عشق و محبت جتاتے۔ اپنی جان کو قربان کرنے کا یقین دلاتے۔ شکیلہ ان کی باتیں نہایت معصومانہ اور بھولے پن سے سنتی۔ آخر میں انھیں کے جذبات سے کھیلتی کہہ دیتی

آپ کو مجھ سے محبت ضرور ہے۔ لیکن مجھ سے زیادہ نہیں۔

شکیلہ کے اس جواب سے وہ دل میں پھولے نہ سماتے تھے۔
ایک دفعہ جب صادق کی والدہ گھر پر موجود نہ تھیں صادق باہر سے آیا اُس نے حسبِ عادت چاروں طرف تاک جھانک کی۔ امّی کو گھر میں موجود نہ پاکر شکیلہ سے پوچھا۔
امّی کہاں ہیں؟
جی میاں ———— وہ پڑوس میں کہیں گئی ہوئی ہیں۔
تم اکیلی ہی ہو۔
شکیلہ مسکرانے لگی، اور بڑے اطمینان کے ساتھ ڈوپٹہ سینے پر کرتے ہوئے بولی۔
تو پھر ڈر کس بات کا ہے؟ اپنا ہی تو گھر ہے۔
بالکل ———— اور میں بھی تو تمہارا ہوں۔
بے شک!
صادق مسکراتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اور ڈوپٹہ سر سے اتار کر رکھتے ہوئے شکیلہ کو آواز دی۔ آواز سنکر فوراً وہ صادق کے کمرے میں پہنچ کر اُس کے پاس جاکر کھڑی ہو گئی۔
کیا حکم ہے؟
بھلا تمھیں کون حکم دے سکتا ہے۔
آپ!
میں اور حکم دوں، میں تو درخواست کر سکتا ہوں ——منظور

کرنا نہ کرنا تمھارے اختیار میں ہے۔

میں اس قابل کہاں ہوں۔ میرے ایسے نصیب کہاں۔

یہ تم نے کیسے جانا؟

در در کی ٹھوکروں اور خدمت گزاری سے۔

کیا یہاں تمھیں تکلیف ہے۔

خدا کا شکر ہے۔ ہزاروں سے اچھی ہوں۔ مگر ....

میں تمھارا مطلب سمجھ گیا۔ اگر مگر سے کام نہیں چلتا۔

تو پھر کام کیسے چلے؟

یہی تو معلوم کرنے کے لئے تمھیں بلایا ہے۔ مجھے تمھاری ضروریات کا احساس ہے۔

شکریہ!

اس سے کیا ہوتا ہے۔ مجھے تمھارے شکریہ کی ضرورت نہیں۔ میں جب تم سے محبت کرتا ہوں تو تمھارا خیال رکھنا بھی میرا فرض ہے اب تو صرف ایک بات بتا دو۔

کیا ہے، فرمایئے۔

یہی کہ انتظار کی ناقابل برداشت اور کٹھن مدّت کتنی باقی رہ گئی ہے۔ جب تک نسرین یہاں موجود تھی تمھیں تکلیف دینے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا تھا۔ وہ کمبخت پر نکلتے ہی ہوا ہو گئی۔ بھلا ہم کہیں مارے گئے تھے۔ خیر جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ اب اپنی بات کرو۔

شکیلہ صادق کی بات کا کیا جواب دیتی۔ گھر تو اکیلا تھا ہی۔ امی کا ڈر بھی نہ تھا۔ انکار کرتی ہے تو آقا ناراض ہوتے ہیں۔ وہ جتنی چالاک تھی اِس وقت اتنی ہی مجبور ہو گئی۔ کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آتی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ آج بچنا ناممکن ہے۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ دل دھڑک رہا تھا۔ سوچا کہ بھاگ نکلوں مگر ہمت نہ پڑی۔ اسی کشمکش و پیچ میں تھی کہ یکایک باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

شکیلہ فوراً صحن میں آگئی۔ صادق پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ گھر میں آنے والے شہریار اور امی تھیں۔ گھبراہٹ تو شکیلہ پر بھی ہوئی لیکن اُس نے خود کو سنبھالا۔ یہاں تک کہ ان دونوں کو ذرا بھی محسوس نہ ہونے دیا اور اپنے کام دھندے میں مشغول ہو گئی۔ اب صادق اپنے تکلف اور چاپلوسی پر پچھتا رہا تھا۔ کبھی ان کے بے وقت آنے پر دل ہی دل میں کُڑھ رہا تھا۔

امی کو بھوک لگ رہی۔ آتے ہی انھوں نے باورچی خانہ کو دیکھا، ابھی کھانا تیار کہاں تھا۔ بیچاری شکیلہ پر برس پڑیں۔ وہ بھی بھیگی بلی بنی رہی۔ شہریار امی کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ بلکہ امی کی اس ناراضگی سے خوب مزے لے کر انتقامی پارٹ ادا کر رہا تھا۔ ادھر شکیلہ کی طرف آنکھ بھی مارتا جاتا تھا۔ شکیلہ بھی اُس کے جواب میں بناوٹی مسکراہٹ دکھا رہی تھی۔ تاکہ شہریار سمجھے کہ وہ اُس کی ہر بات کو برداشت کر سکتی ہے۔

صادق اُٹھ کر باہر جانے لگا تو امی نے پوچھا

کہاں جا رہے ہو؟

امّی جان باغ کی طرف جا رہا ہوں۔ جعفر بھائی صبح سے نوکروں کے کام کی نگرانی کر رہے ہیں۔ میں بھی دیکھوں کیسا کام ہو رہا ہے۔

لیکن میں تو تمھیں لینے آئی تھی۔ میرے ساتھ چلنا۔ بھائی جان کی لڑکی کا لال خط بھیجا جا رہا ہے۔

تو میری کیا ضرورت ہے؟

بیٹا شریک ہونا تو ضروری ہے۔

شہریار کو لے جاؤ۔

تم بڑے ہو۔ تمھارے ہوتے شہریار کا جانا درست نہیں۔ کنبہ کی بات ہے۔ وہ بُرا مان جائیں گے۔

بُرا مانیں گے تو مانیں۔

ایسا نہ کہو بیٹا۔

کیوں؟

یہ کہنا مناسب نہیں۔ آج تم اُن کے کام میں شرکت نہ کروگے تو کل وہ تمھارے ساتھ ایسا ہی کریں گے۔ انھیں موقعوں پر چار عزیز ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ تقریب کی رونق عزیزوں سے ہوتی ہے۔

امّی جان اصل بات یہ ہے کہ مجھے شرم آتی ہے۔

خدا رکھے مرد ذات ہو، لڑکیوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ میں تمھیں ضرور اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی۔ تاکہ تمھاری یہ جھجک ختم ہو۔ ورنہ تمھاری عادت نہیں جائے گی۔

جیسے آپ کی مرضی ! لیکن گھر اکیلا رہے گا۔

شہریار کو یہیں چھوڑ جائیں گے اور پھر شکیلہ تو موجود ہے۔

اتنا سنتے ہی شکیلہ اور چونکی ہوئی۔ کیونکہ شہریار صادق سے کبھی دس قدم آگے تھا۔ لیکن وہ کیا کر سکتی تھی۔ اور یہ کیسے کہتی کہ شہریار کو بھی ساتھ ہی لے جاؤ۔ کیونکہ اس کی حیثیت صرف ایک خادمہ کی تھی۔ اس لئے خاموش ہی رہی۔ صادق ایک قیدی شیر کی طرح مجبور ہو کر رہ گیا۔ اور انتظار کرنے لگا کہ کب امّی جلیں اور میں گھر سے نکلوں۔ اُس نے سوچا تھا کہ امّی کو مکان کے اندر بھیج کر واپس چلا آؤں گا۔ وہ سمجھیں گی کہ میں باہر مردانے میں بیٹھا ہوا ہوں۔ رہا سوال شہریار کا اُسے کسی بہانے سے باہر بھیج دوں گا۔ شکیلہ نے بھی بڑی پھرتی سے کھانا تیار کیا۔ چونکہ وقت بہت کم تھا، اس لئے اُسی وقت سب ایک دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ کھانے سے فراغت ہوئی تو صادق کی والدہ نے ایک پان کی گلوری منہ میں دبائی اور جعفر کا کھانا شہریار کے حوالے کیا اور خود صادق کو ساتھ لے کر بھائی جان کے گھر چلی گئیں۔ امّی کی اس بات سے کہ اُنھوں نے شہریار کو جعفر کا کھانا دے کر باغ بھیج دیا تھا، صادق بہت خوش ہوا۔ کیونکہ اب میدان صاف تھا۔ اور شہریار کے لئے کوئی بہانہ تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اُدھر شکیلہ کو بھی اطمینان ہو گیا کہ جو بات دل میں کھٹک رہی تھی اور جو خطرہ سامنے نظر آرہا تھا ختم ہو گیا۔ کیونکہ صادق امّی کے ساتھ چلا گیا اور شہریار باغ کو، پھر وہاں ستانے والا کون تھا۔

صادق امّی کو لے کر بھائی جان کے گھر پہنچ گیا۔ امّی اندر چلی گئیں، اور

صادق چوپال میں آکر بیٹھ گیا۔ یہاں قصبے کے آدھے سے زیادہ آدمی جمع تھے۔ تھوڑی دیر تک تو صادق وہاں بیٹھا پھر اچانک غائب ہو گیا۔ بھائی جان صادق کو بیٹھا دیکھ چکے تھے۔ اس لیے شکایت کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہا تھا۔

شکیلہ باہر کے دروازے کی زنجیر لگائے خیالات میں غرق ہوئی بیٹھی تھی۔ باہر سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ وہ آواز سنتے ہی سہم گئی۔ سوچا کہ شہریار واپس لوٹ آیا ہے۔ اب کیا ہو گا۔ کہاں جاؤں، کیا کروں۔ وہ اس انتظار میں رہی کہ کسی کے بولنے کی آواز آئے۔ مگر کھٹ کھٹ کے سوا اور کسی کی آواز نہیں آئی۔ کافی دیر بعد ڈھیلے ڈھیلے پاؤں سہمی ہوئی اُٹھی، دروازہ کھول دیا تو صادق کھڑا مسکرا رہا تھا ——————— وہ اس کے واپس آنے کا مطلب سمجھ گئی کہ یہ امی کو دھوکا دے کر آیا ہے۔ ورنہ امی بھی ساتھ ضرور ہوتیں۔

صادق نے شکیلہ کو اتنی بھی مہلت نہ دی کہ وہ اپنا دوپٹہ جو کھونٹی پر لٹکا ہوا تھا اُتار کر اوڑھ سکے جس وقت صادق نے دروازہ کھٹکھٹایا اُس وقت شکیلہ کھانے کے برتن دھو رہی تھی۔ اسی لیے اس کے دونوں ہاتھ راکھ میں بھرے ہوئے تھے۔ شکیلہ دو بچوں کی ماں ہوتے ہوئے بھی کنواری معلوم ہوتی تھی۔ جوانی کے اُبھار نے صادق کے دل پر ایک بھرپور وار کیا۔ وہ بے قابو ہو گیا۔ اُس کو جوانی کے جوش نے اندھا کر دیا۔ آقا اور خادمہ کے رشتے کو بھول گیا۔ اُس نے ایک وحشی کی مانند شکیلہ کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑا اور اپنے ساتھ کھینچتا ہوا کمرے میں لے گیا۔ شکیلہ نے اپنا بچاؤ کرنے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔

لیکن عورت آخر عورت ہوتی ہے کب تک مقابلہ کرتی بے چاری تھک کر نڈھال ہوگئی۔ اُس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے —— قریب تھا کہ زمین پر گر پڑتی قدرت نے اُسے اس آخری اور نازک وقت میں بچا یا۔ شہریار جو جعفر کا کھانا لے کر باغ گیا تھا واپس آگیا۔ گھر میں ایک طوفان برپا تھا۔ وہ دور ہی سے چھپ کر سننے لگا۔ صادق کہہ رہا تھا۔

شکیلہ صبر کی بھی حد ہوتی ہے۔ اب تمہارا کوئی بہانہ کامیاب نہ ہوگا۔ بہتر ہے تم میرا کہا مانو۔ ورنہ پچھتاؤ گی۔

میاں کچھ بھی ہو، ایسا نہیں ہو سکتا۔

کیا تجھے معلوم نہیں کہ انکار کی کیا سزا ہوتی ہے؟

یہی کہ نوکری سے جواب مل جائے گا۔

پھر در در کی ٹھوکریں کھائے گی۔

یہ مجھے منظور ہے۔

شکیلہ میں ایک بار پھر کہتا ہوں۔ سوچ سمجھ کر جواب دو۔

خدا کے لئے مجھے چھوڑ دیجئے۔ ورنہ دیوار میں ٹکریں مار مار کر اپنی جان دیدوں گی۔

آہستہ بول۔ شور مچانے کی ضرورت نہیں۔

ہٹ —— جاؤ —— مجھے بچاؤ

وہ زور سے چلّائی۔ صادق نے شکیلہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

شہریار فوراً کمرے میں داخل ہوا۔ چھوٹے بھائی کو دیکھتے ہی صادق

کی گردن ندامت سے جھک گئی۔ شکیلہ بھی صادق کے پنجہ سے چھوٹ کر بڑی پھرتی سے کمرے سے نکل گئی۔ یوں تو شہریار ان دونوں کی بہت سی گفتگو اپنے کانوں سے سن چکا تھا، لیکن بڑے بھائی کی ندامت اور شرم کو رفع کرنے کے خیال سے کہ گویا اس نے کچھ نہیں سنا شکیلہ پر ہی برسنے لگا۔ جب تک شہریار منہ سے نہ بولا تھا اُس وقت تک صادق کا دل دھڑک رہا تھا لیکن جب یہ یقین ہوگیا کہ شہریار کو اس بارے میں کوئی علم نہیں تو اطمینان ہوا۔ شکیلہ بھی چپ چاپ سنتی رہی۔ اُس کو شہریار کی کوئی بات کبھی ناگوار نہ لگی، کیونکہ اُس کے اچانک آجانے سے اُس کی عزت بچی۔ بلکہ دل ہی دل میں ہزاروں دعائیں دے رہی تھی۔

صادق اُٹھ کر بھائی جان کے گھر چلا گیا جہاں اس کی امّی پہلے ہی سے اُس کو تلاش کر رہی تھیں۔ سامنے سے آتا ہوا دیکھ کر بہت ناراض ہوئیں صادق سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔

لال خط کی تمام رسمیں ختم ہو چکیں۔ مہمان جو صبح سے آئے ہوئے تھے اپنے اپنے گھر کو واپس ہونے لگے۔ صادق اور اُس کی امّی بھی خدا حافظ کہتے ہوئے چل دیئے۔ جب یہ دونوں گھر پہونچے تو وہی نقشہ جو شہریار نے دیکھا تھا وہاں دیکھا۔ لیکن اب آواز شہریار کی تھی جیسے کہ شکیلہ نے کوئی غلطی کی ہے اور اُس پر شہریار ناراض ہو رہا ہے یہ آواز سن کر امّی نے صادق کو ہاتھ کے اشارے سے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ شہریار کی آواز برابر آرہی تھی۔

شکیلہ مجھے اب بالکل بھی اعتبار نہیں رہا۔

غریب نوکرانی اپنی عزت و عصمت بچانے کے نہایت خوشامدانہ باتیں کر رہی تھی کیونکہ شہریار اس معاملہ میں بڑے بھائی سے دو قدم آگے ہی تھا اور اُس کو صادق سے زیادہ شہریار کی نیت پر شبہ تھا۔ اس لئے زیادہ تر وہ ہاں میں ہاں ملاتی رہی کہ کسی طرح امی آجائیں۔ جو آفت سر پر آپڑی ہے وہ باتوں ہی باتوں میں ٹل جائے۔ وہ بولی

چھوٹے میاں آپ اعتبار کریں یا نہ کریں۔ میں بالکل بے قصور ہوں میں نے اپنی زبان سے کبھی یہ نہیں کہا کہ بڑے بابو سے محبت کرتی ہوں، انھوں نے جب کبھی اس قسم کی بات چھیڑی تو میں نے انکار ہی کر دیا۔

میں تمھاری اس بات کو مانتا ہوں کہ تم نے انکار کیا ہوگا، مگر ان کی یہ ہمت کیسے ہوئی کہ ہاتھا پائی تک نوبت پہنچی۔

اس بارے میں کیا بتا سکتی ہوں۔ نہ معلوم آج اُن کو کیا ہو گیا تھا۔ ری بھولی ہو۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔

اس کا یہ مطلب ہے کہ جو کچھ ہو رہا تھا میری مرضی سے۔

بالکل!

خدا کے لیے ایسا نہ کہئے۔

امی جان آجائیں تب تمھاری خبر لوں گا۔

شکیلہ اتنا سنتے ہی اپنی جگہ سے اٹھی اور دوڑ کر شہریار کے قدموں میں گر پڑی۔

میری لاج آپ کے ہاتھ ہے۔

اور میری .... کچھ تو خیال کرو۔

بس چھوٹے میاں زندہ رہنے دیجئے۔

کیا میں سزائے موت دے رہا ہوں۔ تمھاری ذرا سی توجہ کی ضرورت ہے۔ میری ہو کر رہو گی تو کوئی آنکھ تک نہیں ملا سکتا۔ زندگی بن جائے گی ——— کیا سوچ رہی ہو۔ جلدی جواب دو۔

بھلا میں کیا جواب دوں۔

اب تک میں نے جو کچھ کہا وہ بیکار رہا۔ تمھارے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

جو کچھ چاہو سمجھو۔

سیدھی انگلیوں گھی نہ نکلے گا ——— مجبوراً دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔ یہ نہ خیال رکھنا کہ میں صادق بھائی کی طرح بودہ پن دکھاؤں گا۔ میرے پنجے سے نکلنا نا ممکن ہے۔

صادق اپنا نام سنتے ہی چونک پڑا۔ امی نے بھی مڑ کر صادق کی طرف دیکھا۔ صادق کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ چہرہ شرم و ندامت سے کملا گیا۔ آنکھیں زمین پر گڑ کر رہ گئیں۔ اس کے دل میں یہ بھی خوف ہو گیا کہ شہریار اور بھی کچھ کہے گا۔ اور خدا کرے امی کچھ نہ سمجھی ہوں۔

شہریار نے کچھ توقف کے بعد شکیلہ کے کاندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

شکیلہ تم نے سوچ لیا ہو گا ——— کیا خیال ہے؟

چھوٹے میاں ہیں آپ سب لوگوں پر اپنی جان قربان کر سکتی ہوں مگر آپ کے اس حکم کو ....

ہاں ہاں آگئے بھی منہ سے کچھ پھوٹو۔

جو آپ چاہتے ہیں وہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔

شکیلہ کے اس انکار پر شہریار کو طیش آگیا اور وہ اس کو اسی طرح کھینچتا ہوا دالان ہیں لے گیا جیسے کچھ دیر پہلے صادق لے گیا تھا۔

قدرتی بات ہے کہ عورت مرد کے مقابلے میں کمزور ہی ہوتی ہے وہ دالان میں چاندنی پر پڑی سنبھلنے اور اٹھنے کو ہوئی تو شہریار نے اس کی کمر میں ایک لات رسید کردی، اس سے شکیلہ کی چیخ نکل گئی۔ اس آواز پر امی سے نہ رہا گیا ایک دم اندر داخل ہوگئیں۔ ان کے پیچھے پیچھے صادق بھی آگئے۔ شہریار بہت چالاک تھا۔ امی اور صادق کو دیکھتے ہی بات پلٹتے ہوئے بولا۔

امی یہ شکیلہ کس مرض کی دوا ہے؟

امی نے اس بات سے ناواقفیت ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا۔

اب تو اس کم بخت کی روزانہ شکایتیں سنتی ہوں۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آج کیا بات ہوئی جو یہ قیامت برپا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ جو کام تجھ کو بتایا جاتا ہے اس کو کیوں نہیں کرتی، آخر معاوضہ دیتے ہیں۔ بیگار میں تو نہیں آتی۔ معلوم ہوتا ہے یہ حلال کی روزی کھانے کی عادی نہیں ہے۔

امی نے شکیلہ کی طرف دیکھا، وہ خاموش، آنکھوں سے آنسو بہا رہی تھی۔ اُن سے شکیلہ کی اس حالت کو نہ دیکھا گیا، اُن کا بھی دل بھر آیا۔ اور نظروں میں شکیلہ کے سہاگ کا زمانہ آگیا۔ سوچنے لگیں کہ عورت کی زندگی کا مزہ خاوند کی زندگی سے ہے۔ یہ کیوں در در کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی۔ اور جوانی میں تو خدا دشمن کو بھی بیوہ نہ کرے۔ اس حالت میں جو کچھ ہمدردی کرتا ہے بغیر لالچ نہیں کرتا۔ بڑی مچھلی چھوٹی کو نگل جاتی ہے۔ دولت مند غریبوں کی بے بسی سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اس وقت صادق اور شہریار دونوں بڑے غور سے امی کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے۔ لیکن اب اُن کی مجال نہ تھی کہ منہ سے ایک لفظ بھی نکالتے بت کی طرح خاموش کھڑے تھے۔

امی نے اشارہ سے شکیلہ کو اپنے پاس بلایا اور الگ لے جاکر شکیلہ سے اصل واقعہ پوچھا۔ شکیلہ بھی فیصلہ کر چکی تھی کہ اب یہاں کسی صورت سے بھی نہ رہونگی۔ اسی وجہ سے بلا کسی خوف و جھجک کے تمام سرگزشت سنا ڈالی۔ امی صادق کے بارے میں سنکر حیران رہ گئیں سوچا کہ اس گھر میں تو بڑے چھوٹے ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ اگر شکیلہ کچھ دن یہاں اور رہ گئی تو عزت و آبرو خاک میں ملا دیں گے۔ اب مناسب یہی ہے کہ شکیلہ کا بوریا بستر گول کر دیا جائے۔ اس کے علاوہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ وہ چاہتیں تو صادق اور شہریار کو ڈانٹ ڈپٹ کرتیں۔ لیکن جب اولاد جوان ہو جاتی ہے تو ماں باپ احتیاط سے کام لینے لگتے ہیں۔ اسی وجہ سے امی نے ان دونوں سے بھی پوچھ گچھ نہ کی۔ بس شکیلہ کو اپنے ارادے سے مطلع کر دیا۔

شکیلہ ان کا یہ فیصلہ سنکر مسکرائی۔ اس مسکراہٹ پر راقی کو تعجب ہوا بولیں۔ بیگم نوکری چھوٹنے پر مسکرا رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہی نئے ٹھکانے سے بات طے کرلی ہے۔

خیر یہ بات تو نہیں ہے۔ ہاں اب تلاش کرلوں گی۔ رزاق خدا ہے۔

شکیلہ جی تو میرا بھی نہیں چاہتا کہ تم کو اپنے سے جدا کروں۔ لیکن اپنی بدنامی سے ڈر لگتا ہے۔ دنیا والے سوئی کا بھالا بنا دیتے ہیں۔

آپ نے درست فرمایا۔ حالات ہی کچھ ایسے ہوگئے ہیں کہ اب یہاں رہنا میں بھی مناسب نہیں سمجھتی۔ ہاں اتنی التجا ہے کہ چند روز یہاں ٹھہرنے کی اجازت دیدیجئے۔ تاکہ سوچ سمجھ کر قدم اُٹھایا جائے۔

مجھے کب انکار ہے۔ کوئی گھر سے باہر تو نہیں ہو۔ خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر تلاش کرلو۔ جب تک یہاں رہو گی تم سے آرام و راحت ہی ملے گی۔ لیکن یہاں سے جانے کے بعد بہت یاد آؤ گی۔ میں تاکید کرتی ہوں کہ ملنے کے لئے یہاں ضرور آتے رہنا۔

بیگم صاحب آپ تو یاد کریں گی۔ لیکن میرا بھی کیا حال ہوگا ــــــــــ جب آپ کہیں چلی جاتی تھیں تو میں بے چین ہو جاتی تھی۔ اور اب جبکہ میں دور چلی جاؤں گی۔۔۔۔۔ آپ کی یاد بہت ستائے گی۔ واقعی آپ جیسی ہمدرد مالکہ نہیں مل سکتی۔

ہوسکتا ہے کہ مجھ سے بہتر مل جائے۔

اگر لکھنؤ سے خط آگیا تو وہاں چلی جاؤں گی۔ مجھے اس خط کا بہت انتظار ہے۔

اتفاق دیکھئے شکیلہ اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ پوسٹ مین نے دروازے پر آواز دی۔ لفافہ شکیلہ کے نام تھا۔ اُس نے ہاتھ میں لیتے ہی پرکھ لیا۔ اس بُرے وقت میں یاد کرنے والا کون ہے۔ اُس کو اُمید کی جھلک نظر آنے لگی۔ اور طرح طرح کے خیال دل میں آنے لگے۔ لفافہ کھول کر پڑھا تو شکیلہ پر ایک کیفیت سی طاری ہو گئی وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔ صادق کی امی وہاں سے اُٹھ کر چلی گئیں۔ شکیلہ نے کئی بار لفافہ کے مضمون پر غور کیا اور بہت کوشش کے بعد ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ خدا کا شکر ادا کیا ——— ایک در بند ہوتے ہی دوسرا کھل گیا۔ اُس نے صادق کی امی سے جا کر کہا۔

بیگم صاحب جس خط کا مجھے انتظار تھا آ گیا اور اب میں صرف ایک رات کی مہمان ہوں۔ خدا نے چاہا تو کل چلی جاؤں گی۔

انھوں نے بطور ہمدردی اس سفر کے متعلق مفصل گفتگو کی۔ شکیلہ نے بتایا کہ وہ پیدل چلی جائے گی۔ یہ سنکر اُس کی غربت اور پریشانی پر ترس آیا۔ اور فوراً ہی ایک گاڑی والے کو کہلا کر بھیج دیا کہ کسی دوسری جگہ کرائے پر نہ جائے۔ دوسری طرف صادق اور شہریار کو شکیلہ کے جانے کی خبر نہ ہونے دی۔ کیونکہ اُنھیں خطرہ تھا ..... یہ دونوں راستے میں گاڑی روک لیں گے تو کیا ہوگا۔ بس یہی سوچ کر انھوں نے شکیلہ سے بھی کہہ دیا کہ جب صبح جاؤ تو چپ چاپ چلی جانا۔ شکیلہ کو بیگم صاحب کی رائے سے اتفاق تھا اور جیسا اُنھوں نے بتایا شکیلہ نے عمل کیا۔ شکیلہ نے عمل کیا۔ بیگم صاحب نے کچھ نقدی بھی

بطور امداد اُس کو دی۔ اور گاڑی والے کو ہدایت کرادی کہ وہ ٹھکانے پر چھوڑے بغیر واپس نہ آئے۔

شکیلہ سے وہ رات کاٹے نہ کٹ رہی تھی۔ صبح کے انتظار میں بےچین رہی۔ لکھنؤ کے شوق میں خوشی کے مارے نیند بھی نہ آئی۔ اُس کو ایک ایک گھڑی پہاڑ کی طرح گزارنی پڑی۔ خدا خدا کر کے صبح کے پرندوں کی آواز سنائی دی۔

بیل گاڑی دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی۔ شکیلہ نے فوراً اُٹھ کر دبے دبے پاؤں اوپر جا کر بیگم صاحب کو جگایا، سلام کر کے رخصت کی اجازت چاہی۔ وہ اُس کے ساتھ ہی نیچے کی منزل میں آگئیں اور بڑے افسوس کے ساتھ خدا حافظ کہہ کر رخصت کیا۔ شکیلہ بھی روتی ہوئی گاڑی میں سوار ہوگئی۔ گاڑی بان نے بیلوں کی راسوں کو سنبھالا۔ تازہ دم بیلوں نے اشارہ پاتے ہی اپنی راہ لی۔

جب تک شکیلہ کی گاڑی بیگم صاحب کو نظر آتی رہی۔ وہ دروازے سے گاڑی کو برابر دیکھتی رہیں۔ جب گاڑی کا دکھائی دینا بند ہو گیا تو نہایت رنج و ملال کے ساتھ واپس ہوئیں۔ اُسی وقت قریب کی مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ بیگم نے پوری اذان صحن میں کھڑے ہو کر سنی۔ جب اذان ختم ہو چکی تو انھوں نے شکیلہ کے لئے بعافیت لکھنؤ پہونچنے اور وہاں بھی راحت سے زندگی بسر ہونے کی دعا کی۔

بیگم صاحب کی تدبیر بہت کامیاب رہی۔ صادق اور شہریار پڑے

سوتے رہے۔ وہ جس وقت سو کر اُٹھے اُس وقت تک شکیلہ کی گاڑی بہت دُور جا چکی تھی۔

ان دونوں کو شکیلہ کے چلے جانے کا دو روز تک علم نہ ہوا تیسرے روز جعفر نے امّی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ یہاں سے نوکری چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

چھٹا باب

دن رات سردار اسی کوشش میں لگا رہا کہ کسی طرح نسرین کو اپنا نشانہ بنائے مگر نسرین اپنی شیریں زبان ہونے کی وجہ اس کا شکار نہ ہو سکی۔ زہرہ کے کہنے سننے پر کئی بار اُس کے قدم ڈگمگائے لیکن اس کو پہلے دن کے واقعہ سے شک ہو جاتا تھا۔ زہرہ نے ہر پہلو سے اس کو اپنے راستے پر لگانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ اس ناکامی پر سردار کا قہر بڑھتا چلا گیا مگر اس کا اس میں قصور بھی کیا تھا۔ زہرہ کو نا قابل سمجھ کر ملازمت سے الگ کر دیا۔ سردار نے اس سے جتنے وعدے کر رکھے تھے ان کو پورا کرنے سے بھی انکار کر دیا۔

زہرہ کو جواب دینے کا فیصلہ سردار نے اتنی جلدی کیا کہ وہ اس کے نتیجے پر نظر نہ کر سکا کہ وہ اس کے انتقام میں کیا کچھ کر سکتی ہے۔ ورنہ کبھی بھی اس طرح کورا جواب نہ دیتا۔ وہ جواب پاکر خاموش چلی گئی۔ اس وقت

چہرہ اُداس تھا اُس کی تیوری کے بل ظاہر کر رہے تھے کہ اب اُس کی ناراضگی اور نفرت پورے جوش کے ساتھ اُسے انتقام پر مجبور کر رہی ہے کیونکہ اسکی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا تھا۔ تمام خیالی محل مسمار ہو گئے تھے۔

اب نسرین اُس گھر میں تنہا رہ گئی تھی۔ اس کا خوف حد سے زیادہ بڑھ چکا تھا۔ زہرہ کے رہتے ہوئے وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتی تھی۔ لیکن زہرہ کا وہاں رہنا ہی زیادہ خطرناک تھا، کیوں کہ وہ ہر وقت نسرین کو سردار کی ہوس کا شکار ہونے کے لئے جال بچھاتی رہتی تھی۔ اس کے چلے جانے کے بعد کوئی ایسا نہ تھا جو اس کو پھنسانے کی کوشش کرتا۔ موقعہ پاکر سردار ہی چھیڑ خانی کے طور پر کوئی بات کہتا تو نسرین ایسا جواب دیتی کہ وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا۔ دل ہی دل میں سردار ہزاروں تدبیریں سوچتا لیکن ناکامی ہوتی۔ سردار کی ایسی حرکتوں پر نسرین کو غصہ بھی آتا۔ وہ سوچنے لگتی کہ میں کسی سازش سے یہاں اس کے پھندے میں پھنسی ہوئی ہوں۔ کبھی یہ خیال آتا کہ اگر یہ افضل بیگ ہیں تو پھر شادی کرنے پر رضامند کیوں نہیں ہوتے، اور کیوں غلط طریقہ پر چلتے ہیں۔ انھوں نے خواہ مخواہ مجھے گھر سے بے گھر کیا اور ماں باپ کی عزت برباد ہوئی، لیکن نتیجہ بھی کوئی اچھا نہ نکلا۔ اس جال سے کیسے چھٹکارا پاؤں، اور اب جاؤں بھی تو کہاں جاؤں۔ بس اب تو ایک یہی راستہ دکھائی دیتا ہے کہ اس زندگی سے نجات پا لوں ———— یہ بھی مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ تو پھر اور کیا کروں۔ بس جو کچھ ہونا تھا سو ہو گیا۔ جیسی پڑے گی بھگتوں گی۔ قسمت کا لکھا پورا ہو کر رہتا ہے۔

نسرین کو تنہا رہتے ہوئے دو دن گزر گئے۔ سردار نے کئی بار جال پھینکا، مگر وہ راستہ کاٹ کر بچ نکلی۔ اُس کو تمام تمام رات بیٹھ کر صبح کرنی پڑی۔ مگر جب بالکل مجبور ہو گئی تو اس نے بیباکانہ طور پر کہا

افضل صاحب خدارا میری زندگی برباد نہ کیجئے۔

نسرین کیا میں تمہاری زندگی برباد کر رہا ہوں؟ ——— مجھے افسوس ہے کہ تم نے اتنی بات کہہ کر میری تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ بات کہنے سے پہلے اس کے نتیجے پر بھی غور کر لیا کرو۔

میں نے تمام حالات کو پورے غور سے سمجھنے کے بعد ہی کہا ہے۔

یہ تو بتاؤ کہ زندگی کیسے برباد ہو رہی ہے؟

مجھے تعجب ہے کہ آپ مجھ سے پھر بھی یہ سوال کر رہے ہیں۔ میری بات کی سچائی کی تصدیق آپ کا ضمیر کر رہا ہوگا۔

میں صاف بات کہنا اور سننا پسند کرتا ہوں۔ یہ معمہ بازی مجھے پسند نہیں ہے۔

تو سنئے، میں آپ سے کئی بار کہہ چکی ہوں کہ شادی کر لیجئے۔ مگر ہر بار آپ کوئی نہ کوئی بہانہ تراش کر ٹال دیتے ہیں۔ اس کارِ خیر سے بچنا اور گناہ پر مائل ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔

آخر اس طرح تمہارا نقصان کیا ہے؟

اور شادی کرنے میں ہی آپ کا کیا نقصان ہے؟

بات یہ ہے کہ شادی کر کے آدمی پابند ہو جاتا ہے۔ گھر کے چکر کے سوا اور کہیں کا نہیں رہتا۔ چونکہ میں شہر میں آ کر بہت آزاد خیال ہو گیا ہوں اسلئے

پرانی رسموں پر چلنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔

یہ بات تو آپ کو پہلے ہی سوچنی چاہیئے تھی۔

میں سب کچھ جانتا تھا۔ اس لئے سوچنے کی ضرورت نہ ہوئی۔

یہ کیوں نہیں کہتے کہ محبت کا اظہار کرکے ایک بھولی بھالی لڑکی کو فریب کے جال میں پھنسایا ہے۔

اپنے منہ میاں مٹھو بن رہی ہو۔ بھولی بھالی لڑکیاں اپنے گھر سے کبھی فرار نہیں ہوتیں۔

یہ بات اگر آپ ہی نہ کہیں گے تو کون کہے گا۔ کیا شہر والے اُس کو جو خود کو اُن کے حوالے کردے ایسا ہی کہا کرتے ہیں۔ میرا قصور صرف یہی ہے نا۔

نسرین ابھی بگڑا ہی کیا ہے؟

کیا ابھی کچھ اور بھی باقی ہے؟ . . . . ظاہر ہے کہ میں بے بس ہوں جتنا چاہو سنا لو۔

آخر ہوا ہی کیا ہے؟

خدا نے چاہا تو اس سے آگے کچھ اور نہ ہو سکے گا۔

تو کیا میں بلا کسی مقصد کے اتنی پریشانیاں برداشت کر رہا ہوں۔

سردار کی نہ کوئی ملازمت تھی نہ جائداد۔ شہر کے رئیسوں کی ہاں میں ہاں ملانا، خوشامدی باتوں سے اُن کو خوش کرکے اپنا اُلو سیدھا کرنا ذریعہ آمدنی تھا۔ جب سے نسرین آئی تھی زیادہ وقت اُس کے پاس گزرتا تھا۔ اسی وجہ سے آمدنی میں بہت کمی ہو گئی تھی۔ اُس نے خود کو افضل ظاہر کرکے سرکاری ملازم ہی

نہیں بلکہ بہت بڑا افسر بنایا تھا۔ نسرین اُس کی ہر بات کو سچ سمجھ رہی تھی۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ گھر کے اخراجات پورے ہونے مشکل ہو گئے تھے۔ نسرین سے یہ حالت نہ دیکھی گئی تو اُس نے اپنا وہ اثاثہ جو اپنے ساتھ لائی تھی سردار کے حوالے کر دیا تھا۔ سردار کی یہ باتیں سن کر رنج سے نسرین کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے۔ جب ضبط نہ ہو سکا تو کرخت آواز سے بولی۔

افضل صاحب اب تو میرا جوتا اور میرا ہی سر ہو رہا ہے۔ آخر آپ اس سے زیادہ اور کیا فائدہ چاہتے ہیں۔

ان تمام عنایات کا بہت بہت شکریہ۔ مگر ایک درخواست اور منظور فرمالیجئے۔ بس ایک نگاہِ لطف۔ اگر نامنظور ہوئی تو پھر ہر ممکن صورت سے کوشش کی جائے گی۔

ایں خیال است و محال است و جنون۔

نسرین اس ضد کو چھوڑ دو، ورنہ پچھتاؤ گی۔

کچھ بھی ہو ——— میں ان باتوں کو سننا بھی پسند نہیں کرتی۔

دیکھو تمام نشیب و فراز پر نظر کر کے جواب دو۔

افضل صاحب میں مجبور ہوں۔

نسرین اگر مجبور ہے تو اب افضل بھی مجبور ہے۔

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

یہ کہہ کر سردار بھوکے شیر کی طرح نسرین پر ٹوٹ پڑا۔ وہ اُس کی خوفناک آنکھوں کو دیکھ کر سہم گئی۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے منہ کو ڈھانپ لیا۔ مگر سردار نے اسکی

کوئی بھی پرواہ نہ کی اور اُس نے اپنی حیوانیت اور درندگی سے نسرین کی بے بسی و مجبوری سے پورا پورا فائدہ اٹھایا، اور جو چاہتا تھا کر دکھایا۔ جو حسرت تھی پوری ہوگئی۔ اُس کے نفس کی آگ بجھ گئی، اور نسرین پر ایک مردنی سی چھا گئی۔

سردار اپنی جگہ سے اُٹھ کر نسرین کے سامنے آکر فاتحانہ انداز سے بولا۔ نسرین میں کہتا نہ تھا کہ ضد نہ کرو، لیکن تم نے اس کی پرواہ نہ کی۔

نسرین خاموش نیچی نظریں کئے بیٹھی تھی، آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد پھر سردار نے نسرین کے بازو کو پکڑتے ہوئے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا

عورتیں باتیں زیادہ بناتی ہیں۔ جان تک قربان کرنے کو تیار ہوتی ہیں۔ لیکن وقت پر روکھا جواب ——— پہلی ہی سیڑھی پر پاؤں پھسل گئے۔ آئندہ کیا امید کی جا سکتی ہے۔

نسرین اپنے مستقبل کے بارے میں کھوئی ہوئی تھی۔ سردار نے جو کچھ کہا اُس پر بالکل بھی غور نہ کیا، وہ خود ہی جو کچھ زبان پر آیا کہتا رہا۔ اُس نے نسرین کو کافی جھنجھوڑا، مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ آخر کار مجبور ہو کر دروازے کا قفل لگا کر اپنے ٹھکانوں کی طرف چل دیا۔ نسرین ایک قیدی کی طرح گھر میں گھومتی پھر رہی تھی۔ کئی بار دل میں خیال آیا کہ شور مچا کر پڑوسیوں کو اکٹھا کیا جائے تاکہ اس قید سے نجات حاصل ہو۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ یہ لوگ کیفیت معلوم ہونے کے بعد بجائے حمایت کے قصوروار مجھ کو ہی ٹھہرائیں گے۔ ایسا قدم

اُٹھانا خطرناک ثابت ہوگا۔ بس قصور اپنا ہی ہے۔ بزرگوں کے اصول اور طریقوں کے خلاف چلنا ذلت و بربادی کو دعوت دینا ہے۔ اب تک یہ ارمان و آرزو رہی کہ افضل صاحب سے شادی کرکے خوش و خرّم اپنے گھر کو واپس جاؤنگی۔ لیکن اب یہ آرزو بھی ختم ہوگئی ——— زندگی میں دوبارہ گھر کی شکل دیکھنا ناممکن ہوگیا ہے۔

نسرین انہی خیالات میں غرق تھی کہ اس کے کانوں میں دروازے کی طرف سے زہرہ کی آواز آئی۔ وہ ایک دم چونک کر دروازے کی طرف آئی۔ اور کواڑوں کی جھری سے جو دیکھا تو زہرہ دکھائی دی۔ احتیاطاً بغور دیکھنے کے بعد اس کو یقین ہوگیا کہ واقعی دروازے کے باہر زہرہ ہی کھڑی آواز دے رہی ہے تو نسرین نے جوش میں آکر کواڑوں کو جھنجھوڑا مگر اس سے کیا ہوتا تھا۔ کئی بار یہ کوشش کرنے سے بے چاری تھک کر نڈھال ہوگئی اور سر کو کواڑوں سے ٹکرا کر وہیں بیٹھ گئی۔ زہرہ بھی نسرین کی یہ حالت دیکھ کر بے چین ہوگئی۔ اور تسلیاں دیتی رہی۔ نسرین نے نہایت عاجزانہ طریقے سے آبدیدہ ہوکر زہرہ سے کہا۔

زہرہ خدا کے لئے میری مدد کرو اور مجھے اس جیل خانے سے نجات دلاؤ۔

یہ سن کر زہرہ کی ہمت بڑھ کر اور نرمی سے جواب دیا

بہن تم اتنا غم و فکر نہ کرو۔ جہاں تک ممکن ہوگا میں تمھاری مدد کروں گی۔ ہاں اتنا خیال رکھنا کہ میرے یہاں تک آنے کی خبر سردار کو نہ ہو، ورنہ کام بگڑ جائے گا۔ میں اس وقت جا رہی ہوں۔ بہت جلد واپس آؤں گی۔

بڑا احسان ہوگا۔

احسان کی کوئی بات نہیں۔ یہ بات بعد کی ہے۔

زہرہ اتنا کہہ کر چلی گئی اور نسرین دالان میں آ کر بیٹھ گئی۔ زہرہ کی باتوں سے اس کو ڈھارس بندھ گئی۔ وہ اپنے کو آزاد محسوس کرنے لگی تھی اُس کے چہرے پر شگفتگی ظاہر ہو رہی تھی۔ بےچینی سے زہرہ کے آنے کا انتظار کر رہی تھی، اُس کے کان زہرہ کی آواز سننے کے لئے دروازے کی طرف لگے ہوئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد دروازے پر آہٹ ہوئی۔ نسرین کے دم میں دم آیا۔ سمجھی کہ زہرہ آگئی دوڑی ہوئی ننگے پاؤں دروازے پر پہنچی۔ وہ جھرکی سے جھانکنا چاہتی تھی کہ دروازہ کھلا، دیکھا تو سردار مسکراتا ہوا چلا آتا ہے۔ اور دروازے کے قریب ہی نسرین کو دیکھا تو نسرین کی ٹھوڑی پکڑتے ہوئے بولا۔

کیوں، کیا میرا انتظار کر رہی تھی —— واقعی دل کو دل سے راحت ہوتی ہے۔

نسرین کا چہرہ غصّہ سے تمتما گیا، اور بغیر کوئی جواب دیے آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ سردار نے مکان میں داخل ہو کر پلیٹ کر باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کسی کو ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے نسرین کے نزدیک آ کر بیٹھ گیا۔ کسی نے آواز دی۔

ارے بھئی مرزا صاحب!

سردار نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

کون صاحب؟

نسرین کے دل میں فوراً یہ خیال پیدا ہوا کہ آواز دینے والا کوئی زہرہ کا بھیجا ہوا ہے۔

میں ہوں۔

ہیں کون ؟ نام تو بتائیے۔

کیا آواز بھی نہیں پہچانتے۔

اچھا اچھا سمجھ گیا، نواب صاحب ہیں۔ تشریف لائیے۔

نواب صاحب کا لفظ سنتے ہی نسرین پریشان ہوگئی کیونکہ اُس کے والد کو بھی سب لوگ نواب صاحب کہتے تھے۔ وہ سمجھی کہ ابّا جان تلاش کرتے کرتے یہاں آگئے ہیں۔ سوچنے لگی اب کیا ہوگا۔ میں کس طرح ان کو منہ دکھاؤں گی۔ اور کیسے اُن سے بات کروں گی۔ اُن کے دل نے کیسے گوارا کیا کہ جس نے اُن کی اور پورے خاندان کی عزت کو خاک میں ملا دیا ہو اُس کو تلاش کرتے کرتے یہاں پہونچیں۔ ایسی لڑکی کو تلاش کرنا ہی نہیں چاہیئے تھا —————— ہوسکتا ہے کہ وہ مجھے قتل کرنے کے ارادے سے آئے ہوں۔ اگر یہی بات ہے تو اچھا ہوگا کہ اس زندگی سے نجات تو مل جائے گی —————— وہ ان خیالات میں غرق تھی کہ نواب صاحب کھٹ پٹ کھٹ پٹ کرتے ہوئے گھر میں آدھمکے۔ نسرین خوف کی وجہ سے آنکھ بھی اوپر نہ اٹھا سکی۔ نواب صاحب نے نسرین پر ایک گہری نظر ڈالی، پھر سردار سے کچھ اشارے ہوئے۔ بولے

سردار میاں بھابی کے آنے کی خبر بھی نہ دی۔ کیا ہمیں اتنا غیر سمجھتے ہو؟

نواب صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے

تو پھر میں کیا سمجھوں ؟

میں بہت نادم ہوں۔ مہینہ ختم ہونے والا ہے۔ خالی ہاتھ کیسے پہنچتا۔
آپ کا یہ خیال غلط ہے۔ آپس میں ان باتوں کا خیال نہیں کیا جاتا۔
آپ کا کہنا بالکل درست ہے مگر اپنی طبیعت نے گوارا نہ کیا۔
آخر اب بھی تو پتہ چلا۔
اگر آپ تشریف نہ لاتے تو کچھ دن اور ظاہر نہ ہوتا۔

یہ گفتگو سن کر نسرین نے ایک نگاہ ان نواب پر ڈالی۔ اور ذرا اطمینان کا سانس لیا کہ سردار نے بیوی ظاہر کیا۔ اگر وہ اپنے ان دوست سے صاف صاف بتا دیتا تو یہ اس کا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ اُدھر نواب صاحب کی گفتگو سن کر اپنے کو ایک باعزت عورت محسوس کرنے لگی۔ سردار کو اشارہ کرکے بلایا اور کان میں کہا۔

میرا سلام تو کہدو۔

سردار ابھی کچھ کہنے نہ پایا تھا کہ نواب صاحب بولے

سردار میاں یہ بات بڑی غلط ہے۔ کانا پھوسی سے کام نہ چلے گا، جو کچھ کہا جا رہا ہے میں بھی تو سنوں۔

نسرین شرم کے مارے سمٹ کر رہ گئی۔ سردار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

نواب صاحب شک نہ کیجئے۔ انھوں نے صرف سلام کے لئے کانا پھوسی کی ہے۔ خدانخواستہ آپ کی کوئی شکایت نہیں کی۔ اچھا مہربانی کرکے سلام تو قبول فرمائیے۔

سردار میاں میں تو عمر میں آپ سے چھوٹا ہوں۔ سلام تو مجھے کرنا چاہیئے تھا۔

میں دیو ہوں ـــــــ اچھا بھابی جان ذرا ہوشیار ہو جائیے۔ میں سلام کرنے والا ہوں۔

نسرین کو نواب صاحب کے اتنا کہنے پر "ذرا ہوشیار ہو جائیے سلام کرنے والا ہوں" بے اختیار ہنسی آگئی۔ وہ سوچنے لگی، بھلا سلام کرنے کے لئے ہوشیار کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ خدانخواستہ جھگڑا یا فساد تھوڑا ہی ہے جو لوگ پنجے تیز کروں۔ یہ بھی بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ ادھر سردار نے گدگدی کر ڈالی جس سے نسرین لوٹ گئی۔ مگر جلد ہی سنبھل کر بیٹھ گئی۔

یہ رنگ دیکھ کر نواب صاحب نے سردار کو اشارہ کیا کہ نسرین بہت جلد ہمارے راستہ پر لگ جائے۔ یہ تو ایک کھلونا ہے۔

کوئی دو منٹ خاموش رہنے کے بعد نواب صاحب بولے۔

سردار میاں یہ گھونگھٹ بھی ایک مصیبت ہے۔ بھئی ہمیں تو پسند نہیں۔

ابھی نئی نئی ہیں۔ اس لئے شرم آرہی ہے۔ رفتہ رفتہ کم ہو جائے گی۔

بھائی جان بُرا مانو یا نہ مانو۔ اگر آج پردہ نہ اٹھا تو بندہ پھر کبھی اس در پر قدم نہ رکھے گا۔

جی تو نسرین کا بھی چاہتا تھا کہ دوپٹہ اوپر کو سرکا دیا جائے۔ لیکن وہ سردار کے اشارے کی منتظر تھی اور ادھر سردار ہچکچا رہا تھا کہ اگر نسرین نے انکار کر دیا تو کیا ہو گا۔ کس طرح رضامند کیا جائے ـــــــ اگر کامیابی نہ ہوئی تو نواب صاحب مذاق اڑائیں گے۔ آخر کار ہمت کر کے بولا۔

بیگم کیا خیال ہے؟

نواب صاحب نے سردار کے کاندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے نسرین کے جواب دینے سے پہلے کہا۔

سردار میاں اُن سے کیا پوچھ رہے ہو۔ پہلے اپنا دل ٹٹول کر دیکھو۔ یہ تو بے زبان ہیں، ان کو جو حکم دو گے اُس پر عمل کریں گی۔ آخر تو دلہن ہیں۔ آنکھ سے اگر خدا کو نہیں دیکھا عقل سے تو پہچانا ہے۔

نواب کی اس چٹکی پر سردار نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

جناب میں دیور اور بھاوج کے معاملے میں دخل دینا نہیں چاہتا۔

اچھا یہ بات ہے۔

اتنا کہہ کر نواب صاحب نسرین کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے آگے بڑھے۔ قریب تھا کہ وہ نسرین کا گھونگھٹ خود اپنے ہاتھوں سے پلٹ دیتے کہ نسرین تاڑ گئی اور جتنا اُس سے سمٹا جا سکتا تھا۔ ایک طرف کو سمٹ گئی۔ سردار نے موقعہ پا کر نواب صاحب کے بازو کو جھٹکا دیتے ہوئے اشارہ کیا۔ اُدھر نواب صاحب بھی منتظر تھے کہ کسی صورت سردار ہی خود اُس کو انجام دے۔ لیکن سردار اپنے آپ کو بچا گیا۔ شاید اس لئے کہ نسرین کو یہ خیال نہ ہو کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ دونوں کی ملی بھگت ہے۔ نواب صاحب بھی کب چوکنے والے تھے آستینیں چڑھا کر لگے زور آزمائی کرنے۔

گھونگھٹ کا تو ایک بہانہ تھا، ورنہ نواب صاحب کے ہاتھوں نہ جانے کن کن مقامات کی سیر کی۔ وہ ابھی دوپٹہ بھی اچھی طرح ٹھیک نہ کرنے پائی تھی کہ نواب صاحب پھر ہاتھا پائی کے لئے تیار ہو گئے۔ مگر اب نسرین کی تیوری میں بل پڑ چکے

تھے۔ نواب صاحب تاڑ گئے۔ سوچنے لگے کہ اس وقت زور آزمائی کرنا بے سود ہے، کہیں ایسا نہ ہو غل مچا کر پڑوسیوں کو اکھٹا کرے اس لئے بہتر یہی ہے کہ نرمی سے اس کو قابو میں کیا جائے۔ نواب صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔

بھابی جان آپ تو خفا ہو گئیں۔ آپ کی تیوری میں بل پڑے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔ دیہات اور شہر کے لوگوں میں اتنا ہی فرق ہے۔ یہ بھی تجربہ آج ہو گیا۔

نسرین نے نواب صاحب کی بات سنکر جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ اُس کے سامنے دو مرد تھے۔ نواب صاحب سردار سے بھی بازی لئے ہوئے تھے۔ ایسی صورت میں کس کو بُرا کہے۔ وہ خاموش اور کسی خیال میں غرق تھی کہ سردار نے آگے بڑھکر نسرین کو سمجھایا۔

بیگم اتنا اثر لینے کی ضرورت نہیں۔ آپس کی بات ہے۔ نواب صاحب کو بھی مجھ جیسا ہی سمجھو۔

سردار کے منہ سے ایسے الفاظ کا نکلنا جو معنی رکھتا تھا وہ نسرین خوب سمجھ گئی تھی، وہ اب بھی خاموش بیٹھی ہوئی سوچ رہی تھی کہ یہاں رہ کر اس صورت سے زندگی گزارنا ہے تو پھر سردار کی پابند کیوں رہوں ——— اب کونسی صورت اختیار کروں۔ جو کچھ اثاثہ گھر سے لائی تھی ٹھکانے لگ چکا تھا۔ کپڑے بھی صرف دو جوڑے تھے۔ یہ بھی کب تک چلیں گے۔ نسرین کی اس لمبی خاموشی کو دیکھ کر سردار نے کہا۔

بیگم واقعی تم تو بڑی شرمیلی ہو۔ یہ باتیں شہر میں کس طرح نبھ سکتی ہیں۔

نسرین نے بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ دبی ہوئی آواز میں پوچھا۔

نواب صاحب آج پہلی مرتبہ ہمارے یہاں آئے ہیں۔ ایک دم پردہ اُٹھاتے ہوئے شرم آرہی ہے۔ آئندہ جب آئیں گے تب دیکھا جائے گا۔ اس وقت مجبور نہ کریں۔ میں معافی چاہتی ہوں۔

بھابی جان آپ یہ کیا کہہ رہی۔ بڑی ہوکر چھوٹے سے معافی مانگ رہی ہیں۔ اتنا تو گستاخ نہیں جو آپ کی اس بے ادبی کو برداشت کرلوں۔ مجھے خدا ایسا دن نہ دکھائے جو ایسی حرکت کروں۔

گستاخی کی کیا بات ہے؟

یہ گستاخی نہیں تو اور کیا ہے۔ کہیں بڑے بھی معافی مانگتے ہیں۔

اچھا اس بحث کو چھوڑو۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔

اگر ساتھ ہی گھونگھٹ بھی پلٹ دو تو بڑا احسان ہو۔ آپ تو جانتی ہیں کہ بڑے چھوٹوں کی ضد پوری کیا کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میری اس ضد کو پوری کرکے خوش کروگی۔

نواب صاحب کی ان میٹھی میٹھی باتوں سے نسرین نرم ہوتی جارہی تھی مگر اُس کا خیال تھا کہ اگر پردہ اُٹھا دیا گیا تو فوراً آگے قدم بڑھایا جائے گا۔ اتنا ہی سوچنے پائی تھی کہ سردار موقعہ پاکر نسرین کی پشت پر پہونچ گیا۔ اور بڑی پھرتی سے نسرین کا دوپٹہ سر سے اتار لیا۔ وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ مارے شرم کے منہ ہاتھوں سے چھپا لیا۔ مگر سردار نے بڑی پھرتی سے اُس کے ہاتھ بھی اپنی طرف کو کھینچ لئے۔ اب وہ کھلم کھلا نواب صاحب کے سامنے نیچی نظریں کئے مجبور کھڑی تھی۔ ان دو ظالم مردوں کے قبضے میں تھی۔ اس کا کوئی یار و مددگار نہ تھا۔ اس لئے سوائے خاموشی کے اور کوئی

چارہ نہ تھا۔ یہ بات ضرور تھی کہ نواب صاحب کے دل میں سردار کے مقابلہ میں پھر رحم تھا۔ اُن سے نسرین کی آزردگی نہ دیکھی گئی۔ سردار سے دوپٹہ چھین کر نسرین کے حوالے کرتے ہوئے بولے۔

بھابی جان ناراض نہ ہوں ——— اپنوں ہی سے بے تکلفی سے اسی طرح کھل کر مذاق ہوتا ہے۔ مگر میں معافی چاہتا ہوں۔

نسرین نے تو کوئی جواب نہ دیا۔ مگر سردار نے کہا۔

جناب معاف تو ایک کوڑی بھی نہ ہوسکے گی ——— بغیر منہ دکھائی دئے جانے لگے۔

بہت خوب! مدعی سست گواہ چست۔

کیا مطلب؟

صاحب معاملہ تو خاموش ہیں۔

کیا بیگم منہ دکھائی خود طلب کریں؟

ہونا تو یہی چاہیئے۔ ان کے کہنے پر ہی رقم جیب سے آسانی سے نکل سکتی ہے۔ مگر اس وقت نہیں۔ ان کا میرے مکان پر آنا ضروری ہے۔

یہ گھر بھی تو آپ کا ہی ہے۔

اس سے انکار کون کرتا ہے۔ تب ہی تو میں یہاں آیا ——— بھائی صاحب بات یہ ہے کہ بھابی جان کو دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ اس انتخاب اور کامیابی پر بے انتہا مبارک باد دینے کو جی چاہتا ہے۔

بیگم سن رہی ہو۔ نواب صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔

میں نے تو کچھ بھی نہیں۔ وہ تو خاموش بیٹھے ہیں۔ ہاں اگر آپ کچھ کہنا چاہتے ضرور کہیں۔

یہ سنکر نواب صاحب ذرا چونکے، پھر گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

بھابی جان اگر آج غریب خانے پر تشریف لے چلیں تو بڑی عنایت کریں۔

شکریہ۔

شکریہ کی ضرورت نہیں ———— میری خواہش ہے کہ شام کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں۔

نسرین کیا جواب دیتی۔ اس وقت وہ ایک کٹھ پتلی کی طرح تھی۔ اسی لئے اس نے سردار کی جانب دیکھا۔ نواب صاحب تاڑ گئے، فوراً سردار کے کاندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے۔

بھائی صاحب میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں، جو کچھ آپ چاہیں گے وہ ہوگا۔

میں تو تیار ہوں۔

اگر آپ تیار ہیں تو بھابی جان کو کوئی عذر نہیں۔

وہ تو خاموش ہیں۔

کسی کہا ہے۔ خاموشی نیم رضا۔

نواب صاحب کے اس جواب پر نسرین اور سردار دونوں لاجواب ہوگئے۔

نسرین نے لباس بدلا۔ کچھ دیر بعد تینوں نواب صاحب کے گھر پہونچ گئے۔

ان کے جانے کے بعد زہرہ آئی۔ دروازے پر قفل لگا ہوا دیکھ کر دل کی دل میں واپس لوٹ گئی۔

ساتواں باب

شکیلہ صادق کے گھر سے رخصت ہو کر بخیریت لکھنؤ پہنچی۔ شہر پہونچ کر وہ نسرین بن گئی تھی، کیونکہ افضل کو نسرین کی ضرورت تھی۔ اُسے افضل کی کوٹھی تک پہونچنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ جمالو جو افضل کا نوکر تھا بیل گاڑی کو کوٹھی کے احاطے میں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ سمجھا کہ شاید یہ لوگ راستہ بھول کر یہاں آگئے ہیں۔ دوڑا ہوا گاڑی کے پاس پہنچا۔ بولا کہ یہ سرکاری کوٹھی ہے۔ اس میں افضل بابو رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگ راستہ بھول گئے ہو۔ یہ سنکر شکیلہ نے جمالو کو بتایا کہ ہمیں افضل بابو سے ملنا ہے۔ جمالو یہ سنکر ذرا خاموش ہوا۔ پھر گاڑی بان سے ذرا ٹھہرنے کا اشارہ کرکے کمرے میں گیا۔ افضل نے اس طرح آنے کی وجہ پوچھی تو جمالو نے بتایا کہ بیل گاڑی میں کوئی خاتون آئی ہیں، وہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔ یہ سنکر افضل کی خوشی کی حد نہ رہی۔ آتشِ شوق بھڑک اُٹھی فوراً جمالو

کے ساتھ باہر نکل آیا۔ گاڑی کو کمرے کی برابر لگانے کا اشارہ کیا گیا، اور گاڑی بان
نے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بیلوں کو ہانک کر گاڑی کوٹھی کے دروازے پر لے آیا۔
افضل نے بصد اشتیاق و مسرت گاڑی سے اپنی نسرین کو اتارا۔ لیکن اُس کے
لباس اور عمر کو دیکھ کر افسردہ سا ہو گیا۔ ساتھ ہی اُس کو خیال آیا کہ سفر کی تکان
اور پریشانی قوی سے قوی کو بھی مضمحل کر دیتی ہے ــــــــ افضل اور نسرین
(شکیلہ) دونوں اندر چلے گئے۔ جمالو نے گاڑی بان کو کہہ کر گاڑی ایک کونے
میں کھڑی کرا دی۔ بیلوں کے لئے چارے کا انتظام کر دیا۔ شکیلہ افضل کو پا کر
بہت خوش تھی۔ اُس کا چہرہ جو تھوڑی دیر پہلے مرجھایا ہوا دکھائی دیتا تھا چمکنے لگا تھا
اُس نے بالکل رئیسانہ شان سے غسل کے لئے پانی گرم کرنے کے حکم دیا۔ جمالو نے
بڑی پھرتی سے پانی گرم کر کے شکیلہ کو اطلاع دی۔ وہ نہانے چلی گئی۔ غسل خانے
سے آکر اُس نے دیکھا تو میز پر چائے رکھی ہوئی تھی اور افضل اُس کا بےچینی سے
انتظار کر رہا تھا۔ وہ تولیہ سے بال سکھاتی ہوئی آکر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور بغیر کسی
جھجک کے جمالو کو چائے بنانے کا اشارہ کیا۔ جمالو بے چارہ بہت ہی نیک اور
سیدھا آدمی تھا۔ اسی لئے افضل نے اُس کو ملازم رکھا ہوا تھا۔ وہ اکثر ایسی غلطیاں
کر جاتا تھا کہ کوئی دوسرا شخص فوراً جواب دیتا، مگر افضل برداشت کر جاتا تھا۔ جمالو
نے اشارہ پاتے ہی چائے بنانا شروع کیا اور دودھ، چینی اور چائے کا پانی ایک
جگہ اکٹھا کر کے چمچہ چلانا شروع کر دیا۔ شکیلہ کی جونہی نظر پڑی تیوری میں بل پڑ گئے۔
افضل فوراً تاڑ گیا۔ اس نے فوراً وہ کیتلی واپس کر دی اور دوسری بار چائے کا
پانی تیار کرنے کو کہا۔ افضل کی اس ہوشیاری پر شکیلہ نے دل ہی دل میں داد دی۔

جمالو دوسری بار بہت جلد چائے کا پانی تیار کر کے لایا۔ بہت تکلفات اور مسرت کے ساتھ چائے کا دور ختم ہوا۔ اس کے بعد جمالو کو کھانا تیار کرنے کی ہدایت کی گئی۔ افضل اور نسرین پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ گھر کی خیریت معلوم کرنے کے بعد افضل نے پوچھا۔

جناب کا حلیہ کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا ہے۔ زمیندار صاحب کے گھرانے کا تو لباس اور ہے۔

نسرین مسکرائی اور نیچی نگاہ کر کے بولی۔

تو کیا میں اصل لباس میں گھر سے نکلتی۔ ذرا سوچئے تو بغیر بھیس بدلے یہاں کس طرح سلامتی کے ساتھ پہنچ سکتی تھی۔

تب تو درست ہے۔ میں الفاظ واپس لیتا ہوں۔

اگر میرے ہی پاس رہ جائیں گے تو کیا حرج ہے۔

نسرین کی اس حاضر دماغی پر افضل نے بیتابانہ طور پر اُسے سینے سے لگا لیا اور اس زور سے بھینچا کہ بے چاری کی پسلیاں بولنے لگیں۔ لیکن اُس نے افضل کے جوش و بے تابی کو دیکھتے ہوئے اُف تک نہ کی۔ دوسری مصلحت افضل کو اپنے جال پھنسانا اور مانوس کرنا تھا۔ افضل جلد ہی اس سے جدا ہو گیا اور دل ہی دل میں لاحول پڑھنے لگا۔ کہ جو چیز جائز طریقے سے مل سکتی ہے اُس کو ناجائز طور سے کیوں حاصل کیا جائے۔ نسرین صرف میری ہے اور میری ہی رہے گی۔ لیکن اب وہ جائے گی بھی کہاں۔ میرے علاوہ اس کا کوئی اور ٹھکانا بھی تو نہیں ہے۔ افضل کو اپنی اس غلطی کا احساس تھا، اس لئے نسرین سے آنکھ ملانے میں جھجک ہو رہی تھی۔

افضل ایک گہرا سانس لیتے ہوئے دبی آواز میں بولا۔

نسرین یہ شیطان مردود کی حرکت تھی جو وحشی پن مجھ سے سرزد ہو چلا تھا تمھیں تکلیف ہوئی ہوگی۔ میں اس پر نادم ہوں۔

وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ اور گردن جھکا لی۔ جیسے اُس کو شرم آرہی تھی۔ افضل نے اس کی ٹھوڑی کو اوپر کیا۔ نسرین نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے معصومانہ انداز میں افضل کو دیکھا۔ پھر رنجیدہ شکل بناتے ہوئے بولی

اب میں آپ کی ہوں اور آپ کے پاس ہی رہوں گی۔ میری تکلیف آپکی تکلیف، اور آپ کی تکلیف میری تکلیف ہے۔ پھر ایسی باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہاں ایک وعدہ کرنا ہوگا۔ یہ سنکر افضل چونک پڑا اور نسرین کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔

کیا وہ وعدہ کرنا ضروری ہے؟

جی ہاں۔

ایک کیا دس کرالو۔

مجھے تو صرف ایک ہی وعدہ کرانا ہے۔ مگر جوش میں آکر وقتی طور پر بغیر سوچے سمجھے اقرار نہیں کرنا۔ پھر وقت آنے پر سب کچھ بھلا دو۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور پھر وعدہ خلافی بھی تمھارے ساتھ۔ نسرین میں احسان فراموش نہیں۔ جانتا ہوں کہ تم نے میرے لئے اتنی بڑی قربانی دی ہے۔ میں کیا ہوں اور کیسا ہوں۔ یہ سب کچھ چند روز کے بعد تم پر ظاہر ہوگا۔

خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔

ہاں یہ تو بتاؤ، کیا وعدہ کرانا چاہتی ہو۔

اپنا ہاتھ دیجئے۔

افضل نے داہنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ نسرین نے اپنا ہاتھ افضل کے ہاتھ پر رکھ دیا، دونوں نے ایک دوسرے کو مضبوط پکڑ لیا۔ نسرین نے آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

یہ ہاتھ چھوڑا تو نہیں جائے گا۔

توبہ کرو۔ اب تو جان جانے کے بعد ہی چھوٹ سکتا ہے۔

اگر آپ کے والدین نے مخالفت کی تو کیا جواب ہوگا۔

شرعی بندھن میں بندھنے کے بعد کس کی مجال ہوگی کہ تمھاری طرف انگلی اٹھا سکے۔ اس وقت جو کچھ ہوگا وہ میری مرضی سے ہوگا۔ ایسی باتیں سوچنے سے کیا فائدہ۔ اس کوٹھی میں آنے کے بعد تم کو مطمئن ہو جانا چاہیئے۔

نسرین اپنی کامیابی پر مطمئن ہو گئی تھی۔ اس کی نظر میں در و دیوار بھی رقص کرتے تھے۔ ہر چیز پر تازگی اور نکھار سا محسوس کر رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ گردن کو جھٹکا دیتے ہوئے افضل کی طرف دیکھا اور پھر نیچی نگاہیں کر لیں۔ ادھر افضل بھی اپنے کو کامیاب سمجھتے ہوئے ایک نئی زندگی اور طاقت کا مالک سمجھتا تھا۔ اس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں ایک نئی روح داخل ہو گئی ہے، وہ بھی نسرین کی طرح آنکھ مچولی سی کھیل رہا تھا۔ کچھ دیر بعد افضل نے خود ہی پوچھا۔

بس یہی وعدہ یا اقرار کرانا تھا؟

جی بس۔

آخر یہ خیال تمھارے دل میں کیسے آیا؟

سنا ہے کہ مرد بڑی جلدی بے وفائی پر اُتر آتے ہیں۔

میں یہ کیسے مانوں کہ قصور وار صرف مرد ہی ہے۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ اگر دونوں میں ایک ذرا بھی سمجھدار ہو تو کبھی ایسی بات نہیں ہو سکتی۔ میرے خیال میں عورتیں ہی جھگڑالو ہوتی ہیں۔

اس بات پر نسرین کو ہنسی آگئی۔ بولی

یہ بھی خوب ہے کہ عورتیں مردوں کو قصور وار ٹھہراتی ہیں اور مرد عورتوں کو۔ یہ مستقل جنگ اسی صورت میں ختم ہو سکتی ہے کہ دونوں خلوص سے مل کر اقرار کریں کہ ایک دوسرے کی شکایت کو رفع اور غلطی کو نظر انداز کر دے۔

بالکل درست ——— آپ کا فیصلہ قابلِ تعریف ہے۔

افضل نے بات کا رُخ بدلنے کے لئے کہا۔

خود تو اپنا اطمینان کر چکی ہو مگر میرے لئے کوئی بات نہ کی۔

سنئے میرا پہلو کمزور ہے، اور آپ کا قوی۔ میں ایک خادمہ اور آپ آقا۔ میں محتاج اور آپ صاحبِ اختیار۔ ثبوت میں زندہ مثال آپ کے سامنے ہے۔ کہ پورے خاندان کو چھوڑ کر میں نے خود آپ کے حوالے کر دیا۔

کیا یہ ناممکن ہے جس طرح اپنے خاندان کو چھوڑ کر افضل کو اپنایا ہے ایک دن افضل کو بھی چھوڑ کر تیسری منزل تلاش کر سکتی ہو۔

تیسری تو ابھی سے نگاہ میں ہے حقیقی سکون و راحت وہیں ملتی ہے اور

وہ ہے قبر۔

خدا نہ کرے ایسی باتیں نہ کرو۔ مجھے قبرستان سے ڈر لگتا ہے۔

مگر وہاں جانا یقینی ہے۔

لیکن وقت سے پہلے یہ غم کیوں سوار کیا جائے۔

شام ہو چلی تھی۔ کمرے میں روشنی کر دی گئی۔ جمالو نے ہدایت کے مطابق کھانا تیار کر لیا تھا۔ اب اُسے افضل کے حکم کا انتظار تھا۔ مگر یہ گفتگو ایسی چھڑی تھی کہ ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ یہاں تک کہ کھانے کا بھی وقت نکل چکا تھا۔ جمالو انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ اس کے کان افضل کی طرف لگے ہوئے تھے۔ مجبور ہو کر ڈرتے ڈرتے دبے دبے پاؤں ڈرائنگ روم کے سامنے پہونچ کر کھنکارنے لگا۔ افضل نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا

کیا بات ہے؟

سرکار کھانے کا وقت گزر چکا ہے۔ حکم دیجئے۔

ہاں بہت دیر ہو گئی ہے۔ لیکن باہر کیوں کھڑے ہو۔

حضور..... (نسرین کی طرف دیکھتے ہوئے) ان کی وجہ سے....

پاگل ہو...... دیکھو یہ تمھاری مالکہ ہیں۔ تمھیں اب انہی سے زیادہ واسطہ پڑے گا۔

جمالو نے ایک نظر اپنی مالکہ کو دیکھکر نیچی نظریں کر لیں۔

نسرین مسکراتے ہوئے بولی

بیچارہ سیدھا ہے۔

اچھا بہت جلد کھانا لاؤ۔

افضل کا حکم ملتے ہی جمالو فوراً باورچی خانے گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد کھانا لیکر آ گیا۔ نسرین کے دل میں غریب غربا کا بہت درد تھا۔ وہ بڑے لوگوں کے برتاؤ سے پوری واقفیت رکھتی تھی۔ اُس نے اسی وجہ سے خود کھانے سے پہلے اپنے گاڑی بان کو کھانا بھجوایا۔ اس کے بعد کھانے کو ہاتھ لگایا۔ اس کے اس رویّہ سے افضل پر بڑا اثر ہوا۔ کیونکہ افضل خود اسی خیال کا انسان تھا۔ دونوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا اور پھر افضل کے بہت اصرار پر چہل قدمی کے لئے کوٹھی سے باہر نکلے۔

یہ دونوں ٹہلتے ٹہلتے بہت دور نکل گئے۔ راستہ تو اتنی دیر کا نہ تھا مگر ہر ہر قدم پر افضل کے ملنے جلنے والے ملتے رہے۔ اور ہر ملنے والے کے ساتھ دو دو تین تین منٹ تک بات چیت کرنے میں کافی دیر ہو گئی۔ نسرین نے تنگ آ کر کہا۔

جناب اب کوٹھی واپس چلیئے۔ میرے لئے ایک قدم چلنا بھی دشوار ہے۔ سفر کی وجہ سے پہلے ہی بہت تھکی ہوئی ہوں۔

بہت اچھا، ہاں ایک ضروری کام تو رہ گیا ہے، اُس کو بھی کرتے چلیں۔

وہ کیا ہے۔ پھر کر لینا۔

دو کو ایک کرنا۔

میں سمجھی نہیں۔

قاضی صاحب خود سمجھا دیں گے۔

نسرین ذرا ٹھٹکی اس پر افضل کو تشویش ہوئی۔ اُس نے گھبرا کر پوچھا۔
کیا میری بات ناگوار گزری ہے۔
جی نہیں۔ ایسا خیال نہ کیجئے۔
پھر جھجک کیسی۔
میرا خیال ہے کہ آپ قاضی کے گھر جانے سے پہلے خدا کے گھر چلیں۔ پھر قاضی کے یہاں جائیں۔
وہاں کس لئے جاتی ہو۔
یہ وہیں چل کر بتاؤں گی۔
اس سے مجھے انکار نہیں۔ واقعی عورت بہت کمزور دل ہوتی ہے۔ میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ اگر تمہاری خوشی اور اطمینان ایسے ہو سکتا ہے تو بندہ حاضر ہے۔

نسرین مسکرائی۔ جو تکان تھی وہ ختم ہوئی۔ پاؤں میں طاقت آگئی۔ اور جلدی جلدی قدم اُٹھنے لگے۔ آن کی آن میں یہ دونوں مسجد تک پہنچ گئے۔ افضل نے دروازے پر ہی نسرین کو روک لیا۔ نسرین نے سبب معلوم کیا تو اُس کو افضل نے بڑی نرمی سے سمجھا دیا۔ اس کو اُن باتوں پر یقین آگیا۔ پھر یہ دونوں منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

تھوڑی ہی دیر بعد میر صاحب کے مکان پر پہونچ گئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا آواز سنکر میر صاحب باہر آگئے۔ افضل کو دیکھا تو دوڑ کر بغل گیر ہو گئے جیسے کہ برسوں کے بچھڑے ملے ہیں۔ انہیں تعجب ہوا کہ آج افضل ان کے دروازے

کیسے آ گئے۔ وہ تو اپنی کوٹھی کے علاوہ کسی کے یہاں اس طرح جاتے ہی نہیں۔ بڑی محبت و احترام سے افضل کا ہاتھ پکڑ کر گھر میں جاتے ہوئے بولے۔

اندر تشریف لائیے۔

جی، کیوں نہیں۔

یہ محترمہ کون ہیں؟

ذرا اطمینان سے بیٹھو، سب بتا دوں گا۔ نسرین آؤ۔ شرماؤ نہیں۔ یہ میرے خاص دوست ہیں۔ بلکہ بندہ انہی کی وجہ سے یہاں پڑا ہے۔

نسرین نیچی نظریں کئے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

یہ میر صاحب کی مردانہ بیٹھک تھی۔ اس کے برابر ہی زنانہ مکان تھا۔ صاحب نے نسرین کو اُدھر بھیجنے کے لئے افضل کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن افضل نے اشارے میں انکار کر دیا۔ میر صاحب خاموش ہو گئے۔ لیکن اس راز کو معلوم کرنے کے لئے بے چین ضرور رہے۔ اس سلسلے میں بار بار گفتگو کرنے کو غیر معقولیت اور نامناسب سمجھتے ہوئے کچھ نہ کہہ سکے۔ البتہ کبھی افضل کو دیکھتے اور کبھی نسرین کو۔ ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق دیکھ رہے تھے۔ افضل کے بدن پر جو لباس تھا وہ نہایت شاندار اور کافی قیمتی تھا۔ لیکن نسرین معمولی اور سادہ لباس میں ملبوس تھی۔ بڑی دیر تک اسی کشمکش و پیچ میں رہے کہ اس کو شریک حیات سمجھنا بھی مناسب نہیں اور خادمہ سمجھنا بھی مشکل ہے۔ کیونکہ جمالو موجود ہے۔ جب بالکل نہ رہا گیا تو میر صاحب کروٹ سی بدلتے ہوئے بولے۔

ہاں جناب کیا بتانا چاہتے تھے ؟

میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ خود ہی سمجھ گئے ہوں گے ۔

اس پر میر صاحب ذرا چونک کر بولے ۔

میں سمجھ گیا ۔ لیکن نام غلط ہے ۔ آپ نے جب بھی کوئی قصہ سنایا تو شکیلہ کے نام سے سنایا اور ہمارے سامنے جتنے خطوط بھیجے وہ شکیلہ کے نام بھیجے ۔ لیکن نسرین کون ہے ——— معلوم ہوتا ہے نام تبدیل کر لیا ہے ۔ نام وہی پیارا ہے ، "شکیلہ"۔

افضل نے ایک نگاہ نسرین پر ڈالتے ہوئے جواب دیا ۔

آپ کا فرمانا بسر و چشم ، شکیلہ ہی سہی ——— یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کی بات کو نظر انداز کر دیا جائے ۔

میر صاحب اپنی اس رائے کو منوانے پر پھولے نہ سما رہے تھے ، اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں ہاتھ پھیرتے ہوئے اٹھ کر افضل کو ایک طرف لے جا کر پروگرام کے بارے میں معلوم کرنے لگے جس مقصد کے لئے یہ دونوں وہاں گئے تھے بیان کیا ۔ یہ سنکر میر صاحب زنانہ مکان میں پہونچے اور اپنی بیگم کو یہ سارا ماجرا سنایا اور اس بارے میں کچھ مشورہ کر کے واپس آئے ۔ نسرین کو زنانہ مکان جانے کے لئے میر صاحب نے افضل کو اشارہ کیا ۔ افضل نے نسرین کو زنانہ مکان کے دروازے پر پہنچا دیا ، وہاں میر صاحب کی بیگم نسرین کے انتظار میں کھڑی تھیں ۔ جو نسرین کو بڑی محبت اور عزت کے ساتھ اندر لے گئیں ۔ اور اپنا شاہانہ نہایت قیمتی جوڑہ پہننے کے لئے دیا ۔ اس نے بھی شرماتے شرماتے پہن لیا ۔ بیگم صاحبہ نے اپنی شادی کی

تھا بھی شکیلہ کو پہنائی، اور خاص خاص زیورات پہنائے، اور اپنے ہاتھ سے مانگ پٹی کرکے دلہن بنا کر بٹھا دیا۔ جوڑہ اور زیورات شکیلہ کے اتنے درست آئے کہ جیسے شکیلہ ہی کے لئے تیار کئے گئے تھے۔ افضل کا لباس اگرچہ روزانہ کے معمول کے مطابق تھا لیکن ایسا خوبصورت و قیمتی تھا کہ تبدیل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ میر صاحب نکاح کے لئے قاضی کو بلا وا دے آئے تھے۔ انھوں نے بھی آکر دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ میر صاحب دروازے پر پہونچے

آیئے، قاضی صاحب اندر تشریف لایئے۔

حاضر ہوں۔

قاضی جی اندر داخل ہوئے۔ دیکھا نہ تو یہاں بارات ہے اور نہ دولہا۔ سوچنے لگے کہ شاید ان لوگوں نے مذاق کیا ہے۔

میر صاحب نے قاضی جی کے چہرے کو دیکھ کر کہا۔

آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں۔

نہیں۔ آپ کا خیال ہے۔

اتنا جواب دے کر قاضی جی خاموش ہو گئے۔ لیکن میر صاحب کا اطمینان نہ ہوا۔ پھر بولے

نہیں قاضی جی کوئی بات ضرور ہے۔ آپ کا چہرہ بتا رہا ہے۔

آپ کا مطلب؟

قاضی جی آپ تو غصہ کر رہے ہیں۔

اچھا تو بتایئے بارات کہاں ہے؟

بھیڑ بھاڑ کا ہونا کیا ضروری ہے۔ قاضی جی اس کے لئے اسلام مجبور نہیں کرتا۔ میر صاحب گستاخی معاف، میری سمجھ میں کچھ نہیں کسی اور سے نکاح پڑھوایئے۔ اتنا کہہ کر قاضی جی نے بستہ بغل میں دبایا اور دروازے کا رُخ کیا۔ میر صاحب نے دوڑ کر قاضی جی کو پکڑ لیا، اور معمولی کھینچ تان اور کہنے سننے کے بعد قاضی جی کو واپس لاکر افضل کے پاس بٹھا دیا۔ اور بولے

قاضی جی آپ ہمارے بزرگ ہیں۔ بھلا ہم آپ کے ساتھ مذاق کر سکتے ہیں۔ تھوڑی دیر انتظار کریں۔ ابھی باراتی آئے جاتے ہیں۔

اطمینان ہونے پر قاضی جی نے بستہ کھول کر رجسٹر اور قلم دوات سنبھالا۔ بولے

اچھا تو میر صاحب خانہ پوری ہی کرا دو۔

میر صاحب نے افضل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

یہ دولہا ہیں، ان کا نام وغیرہ لکھئے۔

قاضی جی نے افضل کی طرف دیکھا تو پھر سٹپٹائے۔ بولے

ارے یہ دولہا ہیں۔ نہ سہرا ہے نہ صافہ۔ نہ ویسا لباس۔ ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ دولہا ایسے ہیں تو دولہن کیسی ہوگی۔ شاید ایسی ہی چلتی پھرتی مل گئی۔

توبہ توبہ۔ قاضی جی ایسا خیال نہ کیجئے۔

کیا غلط ہے؟

بالکل۔ اس لئے کہ وہ میری بہن ہے۔

تو معافی چاہتا ہوں۔

توبہ توبہ۔ ایسا نہ فرمایئے۔ آپ ہمارے بزرگ ہیں۔

قاضی جی نے عینک اوپر کو سرکاتے ہوئے پوچھا۔
میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس خاموشی سے یہ شادی کیوں ہو رہی ہے۔
اوّل تو میں ہجوم و نمائش کو پسند نہیں کرتا، دوسرے کچھ وجوہ بھی ہیں۔
یہ ہی سہی، لیکن کم ازکم دو چار پڑوسیوں کو تو بلا ہی لیتے۔
بہت اچھا۔ اگر آپ کی خوشی یہ ہے تو ابھی لیجیے۔
یہ کہہ کر میر صاحب فوراً اٹھے اور باہر چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد آٹھ دس آدمیوں کو اکٹھا کر اپنے ساتھ لے آئے۔ افضل قاضی جی کے رجسٹر میں اپنے نام کی خانہ پُری کرا چکے تھے۔ شکیلہ کے نام کی خانہ پُری کے لئے میر صاحب کا انتظار تھا۔ کیونکہ مصلحتاً افضل نے شکیلہ کے بارے میں کچھ لکھوانا مناسب نہ سمجھا۔ میر صاحب کے آتے ہی قاضی جی نے رجسٹر سنبھالا، اور میر صاحب کی طرف مخاطب ہو گئے۔ شکیلہ کے بارے میں میر صاحب کو اگرچہ بہت کچھ واقفیت تھی، لیکن وہ صرف خط و کتابت تک۔ افضل بھی شکیلہ کی آمد کے متعلق میر صاحب کو پوری طرح تفصیل سے نہ بتا سکے تھے۔ کیونکہ انھوں نے وہاں پہونچتے ہی قاضی جی کو بلانے کے لئے کہہ دیا تھا۔ میر صاحب قاضی جی کو اپنی طرف مخاطب دیکھ کر شکیلہ کے سرپرست بن گئے۔ رجسٹر میں شکیلہ کا نام اور مہر وغیرہ درج کرایا۔ کیونکہ وہ تحریری طور پر میر صاحب کی بہن لکھی جا چکی تھی۔ قاضی جی کے کہنے سے تین آدمی گواہ اور وکیل حیثیت سے لڑکی کی اجازت لینے کے لئے زنانہ مکان میں بھیجے گئے۔ شکیلہ نے وہی پارٹ ادا کیا جو ایک کنواری لڑکی کرتی ہے۔ ان لوگوں کے واپس آنے پر قاضی جی نے نکاح پڑھا۔ حاضرین میں سے

مبارک باد کا شور مچا۔ چھوہارے تقسیم ہوئے۔ اس کے بعد قاضی جی اپنا بستہ بغل میں دبا کر رخصت ہوئے۔ ان سے تھوڑی دیر بعد اس شادی پر قیاس آرائیاں کرتے ہوئے پڑوسی روانہ ہوگئے۔ لیکن میر صاحب سے اتنا پوچھنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ شکیلہ نام کی بہن کہاں سے آگئی ——— میر صاحب نے شکیلہ کو اپنے گھر سے اسی طرح رخصت کیا جس طرح ایک بھائی اپنی حقیقی بہن کو رخصت کیا کرتا ہے۔ نند کو اپنے گھر سے جاتے دیکھ کر بھاوج کی آنکھیں تر ہوگئیں شکیلہ پھر عورت تھی۔ بھاوج کے آنسوؤں کو دیکھ ضبط نہ کرسکی وہ بھی کنواری لڑکی کی طرح روتی ہوئی دروازے پر پہونچی۔ سب نے خدا حافظ کہہ کر بگھی میں سوار کرایا۔ کوچوان نے گھوڑوں کی باگیں تان لیں۔ اشارہ پاتے ہی گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ میر صاحب اور ان کے گھر والے اُس وقت تک دروازے پر کھڑے رہے جب تک بگھی نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔

اس تمام کارروائی میں رات کا ایک بج چکا تھا۔ جالو ان کا انتظار کرتے کرتے تھک کر سو گیا تھا۔ کوٹھی کے کواڑ چوپٹ کھلے پڑے تھے۔ بگھی دروازے پر آکر رُک گئی۔ یہ دونوں اُترے۔ افضل نے کوچوان کو کرایہ دے کر رخصت کیا۔ کمرے میں پہونچ کر افضل نے جالو کو آواز دی۔ وہ فوراً ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے تمام دروازوں کو بند کیا۔ پھر افضل کی اجازت سے اپنی جگہ جا کر سو گیا۔

شکیلہ مطمئن تھی۔ بے تکلفی سے ایک مسہری پر جا کر لیٹ گئی۔ اُس کے دل میں نہ کوئی ڈر تھا اور نہ ہی جھجک۔ اُس کے لئے وہاں کوئی چیز اجنبی نہ تھی۔ وہ آج اس انقلاب سے بیحد خوش تھی۔ اُس کا ماضی کیسا گزرا تھا اس کو صرف شکیلہ ہی جانتی تھی۔ اُس نے

اپنے کو ایک معزز گھرانے کی باوقار خاتون ظاہر کیا۔ اس شاہانہ اور شاندار لباس میں شکیلہ کے بکھرے ہوئے حسن و جمال نے افضل کو ایسا مفتون کیا کہ بیتاب ہوکر شکیلہ کی مسہری پر جا دھمکے۔ اس وقت ان کا دل دھڑکنے لگا اور ہاتھ کانپنے لگے، چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ شکیلہ اُس کی اس حالت پر دل ہی دل میں خوش تھی۔ لیکن افضل کو دکھانے کے تیوری میں ڈال لئے۔ کچھ دیر بعد خود ہی بولی۔

اب سونے بھی دیجئے۔

افضل مسکرانے لگا۔

بڑی بھولی ہو.........آج کی رات اور سونا؛

تو پھر!

وہی ....فطرت کا انتشار۔

میں سمجھی نہیں۔

تو اب سمجھ جاؤ گی۔ پیاسا کنوئیں تک پہنچ گیا ہے۔

شکیلہ نے اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتے ہوئے۔

اچھا پانی چاہیئے۔

جی ہاں

اس میں کیا حرج ہے۔ یہ تو ثواب کا کام ہے۔

ابھی لاتی ہوں۔

وہ مسہری سے اٹھنا ہی چاہتی تھی کہ افضل نے جانے سے روک لیا۔ اس پر شکیلہ کچھ کہنا ہی چاہتی کہ زبان بند ہوگئی....... افضل اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔

شادی ہوئے چار ماہ گزر گئے۔ افضل کے تمام دوستوں کو شادی کی اطلاع مل چکی تھی۔ ان کی بیویاں دولہن کو دیکھنے کے لئے آئیں اور طرح طرح کے تحفے پیش کئے۔ یہاں تک کہ اس کا من بھر گیا۔ ان میں ایسی ایسی چیزیں تھیں کہ اس نے اس سے پہلے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی تھیں۔ صبر کا پھل واقعی میٹھا ہوتا ہے۔ جس طرح مصیبتوں میں اُس نے صبر سے کام لیا تھا اُسی طرح قدرت نے عیش وعشرت دے دیا۔

سردار کو بھی افضل کی شادی کا علم ہو چکا تھا۔ مگر ناراضگی کے سبب افضل کے پاس آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ لیکن اُس کی خواہش ضرور تھی کہ کسی طرح وہاں تک رسائی ہو۔ یوں تو سردار جانتا تھا کہ افضل بہت ہی نرم دل کا انسان ہے لیکن خود اس لئے نہ گیا کہ بات نیچی ہو جائے گی۔ اُس کی خواہش تھی کہ کوئی دوسرا اونچ کی حیثیت سے اُس کو پکڑ کر وہاں تک لے جا کر ہم دونوں کا ملاپ کرا دے۔ سردار نے جس روز سے سنا تھا کہ افضل کی شادی شکیلہ کے ساتھ ہو گئی ہے تو اُس کو ملنے کے لئے بےچینی سی لگ گئی تھی۔ وہ صرف حقیقت معلوم کرنے کے لئے میل ملاپ چاہتا تھا۔ کیونکہ اُس کو بھی ایک شکیلہ سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ جب اپنی تدابیر میں ناکام ہو گیا تو یہی تدبیر مناسب سمجھی کہ مقصد کے حصول کے لئے کچھ دیر کے لئے مونچھیں نیچی کر لی جائیں، وہ بھی اپنا دوست ہے۔ یہ سوچ کر سردار افضل کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔

سردار کوٹھی کے احاطہ میں پہنچ کر سب سے پہلے جالو سے ملا۔ اور پوچھا سرکار کہاں ہیں؟

سردار کو کافی عرصے کے بعد دیکھ کر جالو ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ وہ اپنے آقا کے دوستوں کی بھی آقا کے برابر عزت کرتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ بھی اس سے محبت کرتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد جالو بولا۔

سرکار اندر کمرے میں ہیں۔ لیکن آپ اندر نہیں جا سکتے۔

یہ الفاظ سن کر سردار ٹھٹک کر رہ گیا۔ پھر چونکتے ہوئے پوچھا۔

کیوں بھئی اب کیا بات ہوگئی۔

یہ تو سرکار ہی بتا سکتے ہیں۔

ایسی کیا بات ہے جو تم نہیں بتا سکتے۔

بس ایسی ہی بات ہے۔

اتنا کہہ کر جالو کمرے کے اندر چلا گیا۔ اس نے افضل کو اطلاع دی کہ آپ کے دوست سردار ملنے آئے ہیں۔ افضل کو سردار کے آنے کی خبر سن کر تعجب ہوا۔ کیوں ان دونوں کے کافی عرصے سے تعلقات منقطع ہو چکے تھے۔ مگر افضل سردار کے مقابلے میں کافی فراخ واقع ہوا تھا۔ سوچا کہ دروازہ تو ہر آنے والے کے لئے کھلا ہوا ہے۔ ایک ناراض دوست کافی عرصے کے بعد آیا ہے۔ نہ معلوم کیا بات ہے جو آج اُس نے اپنی آن توڑی ہے۔ ضرور ملاقات کرنی چاہیئے۔ اس میں بھی اپنی ہی عزت ہے، اسی خیال کو لے کر آہستہ آہستہ کمرے سے باہر آیا۔

سردار دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔ دیکھتے ہی فوراً بولا

آہا سردار بھائی ہیں۔ آیئے آج کیسے راستہ بھول آئے۔

بھولا نہیں بلکہ یاد کرکے آیا ہوں۔

بہت بہت شکریہ۔ میرے نصیب ایسے کہاں ؟

کیوں نہیں۔

فرمایئے کیسے تکلیف گوارا کی۔ خیریت تو ہے۔

تکلیف دینے آیا ہوں۔ ویسے تو خدا کا فضل ہے۔

دونوں نے مصافحہ کیا اور افضل سردار کی بغل میں ہاتھ ڈال کر کمرے کے اندر لے گیا۔ شکیلہ ان دونوں کے قدموں کی آہٹ سن کر پہلے ہی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اور کمرہ خالی تھا۔ دونوں برابر برابر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جمالو افضل کا اشارہ پاتے ہی فوراً چل دیا۔ افضل نے بھی اپنی شادی کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ اگرچہ اس کو یقین تھا کہ سردار کو اس کی شادی کا علم ہو چکا ہے۔ تھوڑی دیر بعد جمالو چائے تیار کر کے لے آیا، اور سردار کی طرف مخاطب ہو کر بولا

بیگم صاحب سلام عرض کرتی ہیں۔

یہ سنکر سردار ایکدم اچھل پڑا۔ بولا

بیگم صاحب۔ کس کی بیگم۔

جمالو نے کوئی جواب نہ دیا، اور مسکراتا ہوا واپس چلا گیا۔ سردار بھلا یوں کب خاموش بیٹھنے والا تھا۔ بات پکڑلی۔ چائے کا بھی خیال نہ کیا، اور افضل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ افضل نے اگرچہ بہت دیر تک ادھر اُدھر کی باتوں میں اُلجھانے کی کوشش کی۔ مگر جب دیکھا کہ سردار کسی صورت بھی باز نہیں آتا تو مجبوراً اقرار کر ہی دیا۔ سردار نے پوچھا،

یہ تو فرمایئے ہماری بھابی کہاں کی باشندہ ہیں۔
افضل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
بھئی تم سے کوئی راز چھپا ہوا نہیں ہے۔ تمام خط و کتابت کا تمھیں علم ہے،
انھیں نواب صاحب کی لڑکی ہے جن کے یہاں سے منگنی چھوٹ گئی تھی۔
سردار نے تعجب سے افضل کی طرف دیکھا۔ افضل نے بھی سردار کی طرف دیکھا، سردار کی خاموشی پر افضل کو خیال ہوا کہ بجائے مبارک باد کے کیوں خاموشی اختیار کی ہے۔ ضرور کوئی بات ہے۔ سردار بغیر کچھ کہے سنے واپس جانے لگا۔ افضل نے روکتے ہوئے کہا۔
معلوم ہوتا ہے کہ تمھیں میری شادی سے رنج پہونچا۔
سردار نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے افضل کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
آپ نے جو فرمایا ہے کہ بھابی نواب صاحب کی لڑکی ہیں اگر واقعی یہ بات درست ہے تو رنج ہونا چاہیئے۔ ورنہ مجھ سے زیادہ خوش ہونے والا کون ہو سکتا ہے۔
شکیلہ بھی ادھر ہی کان لگائے بیٹھی تھی۔ یہ تمام گفتگو بغور سن رہی تھی۔ ذرا دور ہونے کی وجہ سے صاف نہ سمجھ میں آسکیں۔ سردار کا یہ کہنا کہ اگر وہ نواب صاحب کی صاحبزادی ہیں تو دکھ پہنچا ہے شکیلہ کو اپنی پڑ گئی۔ افضل کے چہرے سے بھی پریشانی ظاہر ہو رہی تھی۔ شکیلہ نے جمالو کو بلا کر کہا کہ ذرا سرکار کو میرے پاس بھیج دے۔ مگر کسی ضروری کام میں لگ جانے یہ بات کہنی بھول گیا۔ اور بہت دیر تک واپس نہ آیا۔ شکیلہ گھبراہٹ اور خوف سے کانپ رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ شخص اس معاملہ سے ضرور واقف ہے جو ایسی باتیں کر رہا ہے۔

باتوں باتوں میں سردار نے پوچھا کہ ذرا ہماری بھابی کا نام تو بتاؤ۔
افضل جو کسی سوچ میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ سردار کی طرف مخاطب ہوا۔
اصل نام نسرین ہے مگر لاڈ میں شکیلہ رکھ دیا ہے۔
سردار یہ نام سنکر اور بھی چونکتا ہوا۔ کہنے لگا۔
آپ یقیناً دھوکا کھا رہے ہیں۔ میں نے پرسوں ہی نسرین کو میر صاحب کے گھر کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ سنا ہے کہیں نوکری کر لی ہے۔
کون میر صاحب ؟
جو آپ کے پرانے دوست ہیں۔
ہاں ہاں ایک نوکرانی آئی تو ہے۔ بڑی حسین و جمیل ہے۔ عمر بھی زیادہ نہیں۔
بس بس .... وہی اصل نسرین ہے۔
کچھ دیر کے لئے دونوں خاموش ہو گئے۔
تم نسرین اور نواب کو کیسے جانتے ہو ؟
یہ سوال بہت مشکل ہے۔
مشکل ہو یا آسان جب یہ بات چھڑ گئی تو مکمل ہونی ضروری ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں سارا قصور میرا ہے۔
کیسے ؟
سردار نے شروع سے آخر تک تمام داستان سنائی۔ افضل کا دماغ چکرا گیا اُس نے اپنی زندگی میں پہلی بار دھوکا کھایا تھا۔ سوچنے لگا اگر سردار کی یہ بات درست ہے تو شکیلہ کی حیثیت اُس ہڈی کی مانند ہے جو جلدی میں حلق میں پھنس جاتی ہے۔

جو نہ اُگلی جاسکتی ہے اور نہ نگلی جاسکتی ہے۔ اس کی چھان بین مجھے ضرور کرنی چاہیئے۔
افضل کو گہری سوچ میں دیکھ کر سردار اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور روانگی کے
لئے افضل سے مصافحہ کرنے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

اچھا اب اجازت دیجئے۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ اب سوچنے سے کیا فائدہ۔
سردار یہ کہکر رخصت ہوا۔ شکیلہ اپنے کمرے میں واپس آگئی۔ حسب عادت
افضل کے گلے میں باہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

کس سوچ میں ہیں سرکار؟

کچھ نہیں۔

یہ تو آپ کے جگری دوست معلوم ہوتے ہیں۔

ہاں کافی عرصے سے ناراض تھے۔ آج خود ہی آگئے۔

کیا باتیں ہو رہی تھیں؟

لکھنؤ میں نوابوں اور جاگیرداروں کے علاوہ رکھا ہی کیا ہے۔ قدم قدم
پر نواب اور جاگیر ملتے ہیں۔ یہاں کے ایک بگڑے ہوئے رئیس کا ذکر تھا۔
شکیلہ کو وقتی طور پر کچھ اطمینان ہو گیا ـــ افضل نے اصل گفتگو کو ظاہر نہ کیا۔

آٹھواں باب

سردار نسرین کو اپنے ہمراہ لے کر نواب صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ نواب صاحب بیوی کے ڈر کی وجہ سے ذرا پہلے پہونچ گئے تھے۔ سردار نے دروازہ کھٹکھٹایا نواب صاحب نے ذرا گھبراتے ہوئے نوکر کو باہر بھیجا، اور چہرہ اس طرح بنا لیا جیسے اُن کو کسی بات کا علم ہی نہیں۔ نواب صاحب کے دل پر ایک گولی سی لگ چکی تھی۔ ان کی نیت میں فتور آچکا تھا۔ اپنی ہوس پوری کرنے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں سوچ رہے تھے کہ نسرین کو سردار سے الگ کر دیا جائے۔ لیکن سردار کو اُن کی نیت پر ذرا بھی شبہ نہ تھا۔ البتہ نسرین کے بہانہ سے کچھ دن کے لئے عیش اُڑانے کا خیال ضرور تھا۔ نواب صاحب گردن جھکائے کسی گہری سوچ میں غرق تھے کہ نوکر نے واپس آکر بتایا کہ آپ کے دوست سردار آئے ہیں، اور اُن کے ساتھ ایک برقعہ پوش بیگم بھی ہیں۔

نواب صاحب اٹھ کر دروازے پر پہونچے۔
السّلام علیکم
وعلیکم السلام۔ آج چاند کدھر نکل آیا۔ خیریت تو ہے۔ ذرا ٹھہرو۔
نواب صاحب واپس زنانہ میں چلے گئے۔
بیگم ذرا پردے کا انتظام کردو۔
کون ہے؟
ارے وہی سردار میاں ہیں معلوم ہوتا ہے شادی ہو گئی ہے۔ دلہن کو بھی ساتھ لائے ہیں۔

بیگم بیچاری سیدھی سادی عورت۔ ان کھلاڑیوں کی چالاکیوں کو کیا سمجھتی۔ نئی دلہن کے شوق میں ایک دم کھڑی ہو گئی۔ نواب صاحب سے کہا کہ آپ سردار بھائی سے تھوڑی دیر بات کیجئے۔ میں ابھی بلوالوں گی۔ جلدی جلدی جو سامان اِدھر اُدھر بکھرا پڑا تھا مناسب جگہ پر رکھوایا۔ دروازوں کے پردے چھٹروائے۔ نوکر کو آواز دے کر بولیں۔
سردار بھائی کو بُلا لاؤ۔

نوکر فوراً دروازے پر ان کو اندر بُلا لایا۔ نسرین کو بیگم کے پاس بھیجدیا گیا۔ سردار اور نواب صاحب دونوں باہر ایک کمرے میں بیٹھ گئے۔ عورتیں بہت جلد باہم گھل مل جاتی ہیں۔ اسی طرح یہ دونوں بھی گھل مل بیٹھیں۔ سردار نے گھر سے چلتے وقت نسرین کو خوب سمجھا دیا تھا۔ اس نے بھی اپنی عزت وقار قائم کرنے کے لئے بیوی اور شوہر کا رشتہ ظاہر کیا۔ سردار اور نواب دونوں کے کان

ان کی باتوں پر لگ رہے تھے۔ کچھ دیر سننے کے بعد ان کو اطمینان ہو گیا تھا۔ نواب صاحب اور سرور ادر کو اطمینان تھا کہ نسرین اور بیگم ہماری طرف سے غافل ہیں اسی وجہ سے ان دونوں میں کھل کر اشارۃً اور دبی آواز میں اپنے اپنے مطلب کی باتیں ہو رہی تھیں۔ بیگم کسی شبہ کی بنا پر نسرین کو چھوڑ کر دروازے پر پردے کے پیچھے سے ان دونوں کی حرکتوں کو دیکھ رہی تھیں۔ بیگم کی یہ حرکت دیکھ کر نسرین کے ہاتھ پیر پھول گئے کہ اگر بیگم کے کان میں کوئی بات پڑ گئی تو تمام پول کھل جائے گی، اور یہ آؤ بھگت اور خاطر تواضع ذلت میں تبدیل ہو جائے گی۔ نسرین بھی ہوشیار تھی۔ بیگم صاحبہ کو بلانا تو مناسب نہ سمجھا اور خود ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی، بیگم صاحبہ کی طرف مخاطب ہو کر بولی۔

اچھا بہن اجازت دیجئے۔

بیگم نے پلٹ کر دیکھا۔ نسرین کو کھڑی دیکھ کر بولیں۔

ارے کہاں کو؟

بس آپ سے ملاقات ہو چکی، اور بہت قیمتی وقت آپ کا ضائع کر چکی۔

اس رسمی ملاقات کو چھوڑیئے۔ میں کھانا کھلائے بغیر نہ جانے دوں گی۔

بہن کھانا تو گھر پر تیار رکھا ہوا ہے۔

کچھ بھی ہو۔

پھر دیکھا جائے گا۔

پھر بھی دیکھ لیا جائے گا۔ لیکن آنا اپنے بس کی بات ہے اور جانا دوسرے کی مرضی اور خوشی پر ہوتا ہے۔

بیگم صاحبہ نے نوکر کو بلا کر کہا
سردار میاں سے کہنا کہ بیگم کہہ رہی ہیں کہ آپ کی دلہن جانا چاہتی ہیں۔
لیکن ہماری خوشی ہے کہ کھانا کھا کر جائیں۔

نوکر نے مردانے میں آکر یہ پیغام سنایا۔ نواب صاحب ایک دم چونک پڑے، اور ذرا اونچی آواز سے بولے۔

دلہن ابھی نہیں جا سکتیں۔ اُن کو ایک ہفتہ کے لئے روک لیا گیا ہے۔

نسرین کو وہاں ایک ایک لمحہ بھی گراں گزر رہا تھا۔ نواب صاحب کی یہ بات سنکر تو لرز اٹھی۔ اور تیوری میں بل پڑ گئے۔ وجہ یہ تھی کہ اپنے گھر پر نواب صاحب کی ہاتھا پائی کے بعد نسرین کو اُن کی نیت پر شبہ ہو گیا تھا۔

نسرین کو اداس دیکھ کر بیگم صاحبہ بولیں۔

سردار میاں بھی راضی ہیں اور وہ دلہن کو ایک ہفتہ کے لئے چھوڑ بھی دیں گے؟

کیوں نہیں۔ دلہن کی خوشی پر آپ کی خوشی مقدم ہے۔

نواب صاحب نے سردار کی طرف آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

وقتی طور پر ہاں کر رہے مگر ـ ـ ـ ـ ـ

اگر مگر کی آڑ لینا میں پسند نہیں۔ یہ گھر بھی اپنا ہے۔ ایک ہفتہ کیا میں ایک ماہ کے لئے بھی انکار نہیں کر سکتا۔

اندر سے پھر آواز آئی۔

لیکن دلہن تو ابھی سے گھبرا رہی ہیں۔ گھر جانے کے لئے بیقرار ہیں۔

میں سمجھا دوں گا۔ بھابی جان آپ فکر نہ کریں۔

تو سمجھا دیجئے میں دوسری طرف جا رہی ہوں۔

بیگم صاحبہ دوسرے دالان میں چلی گئیں۔ نوکر کے کہنے پر سردار نسرین کے پاس پہنچ گیا۔ اس کی پیشانی پر شکن پڑے ہوئے تھے۔ وہ نواب صاحب کے یہاں ایک ہفتہ کیا بلکہ ایک منٹ بھی رہنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ اس کی زندگی ایک بھیڑ سے کم نہیں کہ جہاں جاتی ہے وہیں مونڈلی جاتی ہے۔ سردار کی طرف سے اس کو کیا توقعات ہوسکتی تھیں اس کا وہ اس عرصے میں خوب تجربہ کرچکی تھی۔ یہی وجہ ہوئی کہ سردار کے بہت کچھ سمجھانے پر بھی وہ ٹھہرنے پر رضامند نہ ہوئی۔ یہ جتنا نرم ہوا اتنی وہ سخت ہوتی چلی گئی۔ سردار کو جب یہ یقین ہوگیا کہ نسرین کسی صورت ماننے والی نہیں تو مجبوراً سخت لہجہ اختیار کرکے کہا۔

دیکھو نسرین میرے ساتھ رہنے میں یہ ضد نہیں نبھ سکتی۔ میرے کہنے پر عمل کرنا اور میری مرضی پر چلنا ہوگا۔ ورنہ مجھے دوسرا رنگ اختیار کرنا پڑیگا۔

سردار کی یہ کرخت آواز سن کر نسرین ڈر گئی اور دھیمی آواز میں بولی۔

خدا کے لئے پرائے گھر میں اس طرح گفتگو نہ کیجئے۔

اس کی ذمہ دار تم ہو۔

نسرین نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے سردار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔

بے شک آپ درست فرما رہے ہیں۔
تو اب کیا خیال ہے۔
جو حکم دوگے۔
دیکھو ایک ہفتہ یہاں رہو۔ اس کو اپنا ہی گھر سمجھو۔ نواب صاحب اور ان کی بیگم غیر نہیں۔ اور بیگم صاحبہ بڑی خوش مزاج ہیں۔ ان کے ساتھ رہنے میں وقت کا پتہ بھی نہ چلے گا۔ بلکہ یہاں سے جانے کو جی نہ چاہے گا۔
سمجھانے بجھانے کے بعد سردار نے بیگم صاحبہ کو آواز دے کر کہا۔
بھابی جان جب تک آپ کا دل چاہے دلہن کو رکھیں۔
سردار پھر نواب صاحب کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ بیگم صاحبہ نسرین کے رویہ کو دیکھ کر بھانپ چکی تھیں کہ یہ کوئی چلتی عورت ہے۔ اگر سردار کی شادی ہوتی اور نواب صاحب کو پتہ نہ ہوتا، ناممکن ہے۔ اُدھر سردار اور نواب صاحب میں باہم ایسی گفتگو ہو رہی تھی کہ بیگم صاحبہ کا شک یقین میں تبدیل ہو گیا مگر خاوند کو ندامت اور خجالت کے خیال سے یا عزت و احترام کے باعث اُس وقت کچھ کہنا مناسب نہ سمجھ کر خاموش ہو گئیں۔ ورنہ وہ نسرین کو روکنا نہیں چاہتی تھیں۔ انھوں نے صرف رسمی طور پر ٹھہرنے کے لئے کہا تھا کہ دلہن شام کا کھانا کھا کر جائیں گی۔ اس عرصے میں ملازم نے کھانا تیار کر لیا تھا شام ہو چکی تھی۔ اور چاروں طرف چراغوں کی روشنی نے جگمگانا شروع کر دیا۔ دسترخوان پر کھانا آچکا تھا۔ نواب صاحب اور سردار نے ایک ہی جگہ کھانا کھایا۔ تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد سردار نے جانے کے لئے اجازت لی اور

نسرین کو نواب صاحب کے مکان پر چھوڑ کر اپنے گھر کی راہ لی۔ نسرین نے جب سنا کہ سردار چلا گیا ہے تو اس کا پھول سا چہرہ کملا گیا۔ بیگم صاحبہ کی نظریں بار بار اُس پر پڑ رہی تھیں۔ لیکن نسرین جب ان کی طرف دیکھتی تو وہ نگاہیں بچا لیتیں۔ نواب صاحب محسوس کر رہے تھے کہ بیگم کوشش ہو رہا ہے۔ لیکن زیادہ اثر اس لئے نہ لیا کہ وہ سمجھتے تھے کہ بیگم بڑی نیک طینت ہیں۔ جس طرح چاہوں گا سمجھا کر مطمئن کر لوں گا۔ انھوں نے نوکر سے کہا کہ میں ذرا ہوا خوری کو جا رہا ہوں۔ بیگم سے کہنا کہ وہ دلہن کو اپنے ساتھ کھانا کھلا دیں۔ اتنا کہہ کر نواب صاحب نے ہاتھ میں چھڑی لی اور باہر کو چل دئے۔ بیگم صاحبہ نے نوکر کو دسترخوان پر کھانا لانے کے کہا۔ نوکر نے فوراً کھانا سجا دیا۔ اس کے بعد اس کو دروازے پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ بیگم نے نسرین کو دسترخوان پر بلا لیا۔ اور بہت اصرار کے بعد نسرین نے کھانا شروع کیا۔ کھانے کے دوران میں بیگم نے نسرین کے حالات معلوم کرنے کے لئے موقع مناسب سمجھا۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے اتنی محبت اور ہمدردی سے گفتگو شروع کی نسرین کو بیگم کی ہمدردی کا یقین ہو گیا۔ دلہن کے چہرے سے اطمینان ظاہر ہونے پر بیگم نے کہا۔

دلہن مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سردار میاں کا رویہ تمھارے ساتھ اچھا نہیں ہے۔

نسرین بیگم صاحبہ کی چالاکی کو کیا سمجھ سکتی تھی۔ یہ بات سن کر کچھ دیر تو خاموش رہی، دل تو دکھا ہوا ہی تھا۔ بھر آیا۔ اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے ہچکیاں

اُس کا یہ حال دیکھ کر دل میں بہت خوش ہوئیں کہ ضرور کوئی بات ہے۔ انھوں نے دُکھتی رگ کو پکڑ لیا تھا۔ لیکن بظاہر نسرین کی اس تمنا کی پر اور زیادہ ہمدردانہ لہجہ اختیار کر لیا تھا۔ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد پھر وہی سوال کیا۔ نسرین آنسو پونچھنے کے بعد بولی۔

بہن میری داستان سن کر دکھ ہوگا۔

یقیناً میں تمھارا دکھ دور ہونے میں تمھاری مدد کروں گی۔ کیونکہ میں بھی تمھاری طرح ایک عورت ہوں۔ میرے سینے میں ایک درد بھرا دل ہے۔

ان باتوں میں دونوں کھانا بھی بھول گئیں۔ یہاں تک کہ کھانا ٹھنڈا ہوگیا۔ یہ باتیں ہی ایسی چھڑ گئی تھیں کہ بھوک بھی غائب ہوگئی۔ بیگم صاحبہ نے بہت اصرار کیا لیکن نسرین نے بمشکل ایک یا دو نوالے کھائے۔ اور تمام کھانا بچ گیا۔

بیگم نے نوکر بلایا، اُس نے دسترخوان بڑھایا۔ نسرین ہاتھ دھو کر ایک طرف جا بیٹھی۔ اُس کی حالت پر بیگم کو ترس آیا، وہ اُسی کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔ اگرچہ اُن کو خود اپنا بھی خیال تھا۔ کیونکہ عورت اپنے گھر کسی دوسری عورت کے وجود کو برداشت نہیں کرتی۔ یہ بات اور ہے کہ وہ خاوند کے جبر سے کچھ نہ بولے۔ بیگم صاحبہ نسرین کے حالات معلوم کرنے کے لئے بےچین تھیں۔ انھوں نے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد پھر وہی سوال کیا۔

نسرین تم بلا کسی خوف و خطر کے اپنا سارا احوال مجھے بتا دو۔ اسی خیال سے کہ جیسے ایک چھوٹی بہن بڑی بہن کو سنایا کرتی ہے۔ میں امداد کا یقین دلاتی ہوں۔

بیگم صاحبہ کی اس ہمدردی سے متاثر ہوکر نسرین کا دل پگھل گیا۔ وہ اپنی داستان سنانا چاہتی ہی تھی کہ نواب صاحب ہوا خوری سے واپس آگئے۔ نہ معلوم آج کیوں معمول کے خلاف جلد واپس لوٹ آئے۔ ورنہ کافی رات تک باہر رہتے تھے۔ بیگم تو اس سویرے آنے کا مطلب سمجھ ہی گئی تھیں۔ مگر نسرین کا دم گھٹا جاتا تھا کہ اپنا افسانۂ غم نہ سنا سکی۔ اب وہ اس انتظار میں تھی کہ نواب صاحب کہیں جائیں تو سنائے۔ لیکن اب یہ ناممکن تھا۔ اُدھر بیگم صاحبہ کا وجود نواب صاحب کے عیش و عشرت میں ایک دیوار سے کم نہ تھا۔ اسی وجہ سے وہ بار بار بیگم کی طرف دیکھتے۔ پھر کچھ سوچنے لگتے۔ کہ جیسے کوئی بڑا مرحلہ درپیش ہو۔ آخر بیوی سے نواب صاحب کی یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ ہمت کرکے پوچھ ہی لیا۔

کیا بات ہے، آج آپ پریشان نظر آتے ہیں۔

بیگم کے اس سوال پر نواب صاحب چونک پڑے۔ جو نشہ اُن کے دماغ پر مسلط تھا ایک دم کافور ہوگیا۔ اپنے کو سنبھالتے ہوئے بولے۔

تمھارا خیال غلط ہے۔ میں اپنے اندر کوئی تبدیلی محسوس نہیں کر رہا ہوں۔

ہوسکتا ہے کہ آپ کا درست ہو۔

خیال ہی نہیں بلکہ حقیقت۔ ہاں تم ضرور بہک رہی ہو۔ شاید دلہن کی خوشی میں۔ اور ہاں یہ تو بتاؤ کہ دلہن کو کھانا بھی کھلا دیا۔

انھوں نے کھایا ہی نہیں۔

کیوں؟

شاید سردار میاں کی یاد ستا رہی ہے۔ کہ کسی سے بات ہی نہیں کرتیں گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی ہیں۔ ان کا خیال بٹانے کی بہت کوشش کی مگر۔۔۔
بیگم آخر یہ دلہن ہیں۔ سب کے سامنے کھانے پینے شرم آتی ہوگی۔ مناسب ترکیب یہی ہے کہ ان کو تنہائی میں کھانے پر بٹھایا ہوتا۔ ذرا اپنا زمانہ بھی تو یاد کرو۔ برسوں یہی حالت رہی ہے۔ یہ تو پھر نئی نویلی ہیں۔ اچھا دیر نہ کرو۔ ان کو کھانا کھلاؤ۔

بیگم صاحبہ تو ان کی حرکات سے پہلے ہی پریشان تھیں، ان چھچھوری باتوں سے اور بھی پارہ چڑھ گیا۔ ماتھے پر بل پڑ گئے۔ بولیں
ایسی باتیں کرنے سے پہلے اپنی عمر کا تو خیال کر لیا کرو۔
بیگم اس میں جھوٹ کب ہے۔ بیتی باتوں کو یاد دلانا کیا گناہ ہے۔
آپ کی زبان کے مقابلے میں کون جیت سکتا ہے۔
آپ نے بھی حقیقت کو نہیں سمجھا۔ ہاں تو کھانا دلہن کے آگے رکھو۔
بیگم صاحبہ باورچی خانے کی طرف چل دیں۔ نسرین نے نواب صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے انگلی ہلائی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت کھانا نہیں کھاؤں گی۔ اس اشارے کو بیگم نے بھی دیکھ لیا۔ انھوں نے اس کا مطلب یہ نکالا کہ دلہن نے نواب صاحب کو اس قسم کی باتیں کرنے سے منع کیا ہے کبھی بیگم کو کچھ شبہ نہ ہو جائے۔ نسرین نے بھی اُس وقت بیگم کی طرف دیکھا تھا جب وہ اشارہ کر رہی تھی کہ اُن کی نگاہ انگلی پر تھی۔ اس پر نسرین ایک مجرم کی طرح سہم کر رہ گئی۔ اُس کے چہرے سے گھبراہٹ ظاہر ہونے لگی۔ اس وجہ سے

بیگم صاحبہ کو پختہ یقین ہوگیا کہ یہ سردار کی بناوٹی بیوی ہے۔ دھوکا دینے کے لئے یہ ڈھونگ رچایا گیا ہے۔ سوچا کہ اس بارے میں پوری طرح چھان بین کی جائے۔ مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ کیونکہ سامنے کوئی ایسی وجہ نہ تھی جس سے زبان کھولی جاتی۔ بیگم صاحبہ کھانا اتار کر لے آئیں اور نسرین کے سامنے دسترخوان بچھانے لگیں تو اس نے روک دیا۔ مگر یہ کہاں ماننے والی تھیں۔ باوجود خوشامد کے انھوں نے دسترخوان بچھا کر کھانا چن دیا۔ اور نواب کو اپنے ساتھ لے کر دوسری طرف چلی گئیں۔ پہلے تو دونوں میاں بیوی ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر بیگم نے موقع مناسب سمجھ کر ایسی چال چلی کہ نواب صاحب نے خود سردار کی بابت گفتگو شروع کر دی۔ انسان کو ایک جھوٹ کو نبھانے کے لئے بہت جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ اسی طرح نواب صاحب کو اصل قصہ چھپانے کے لئے بیوی کے سامنے کافی جھوٹ بولنا پڑا۔ یہ موقع ان کی زندگی میں پہلا تھا کہ اتنا جھوٹ بولا۔ مگر بیچارے مجبور تھے۔ ورنہ سارا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ وقتی طور پر بیوی نے خاوند کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ مگر ہشیار اور چوکنی رہیں۔ اس سے نواب صاحب کو اطمینان ہو گیا کہ اپنی ہوشیاری سے بیوی کو بیوقوف بنا لیا گیا ہے۔ لیکن یہ بات اُن کے خیال میں بھی نہ آئی کہ عورت کو جب یہ پتہ لگ جاتا ہے کہ کسی عورت کو اُس کے سہاگ میں شریک کیا جا رہا ہے تو پھر صبر وضبط کا دامن چھوڑ دیتی ہے۔ اور جان تک کی بازی لگا دیتی ہے۔ بیگم صاحبہ کتنی بھی بردبار اور سنجیدہ سہی لیکن پھر عورت تھیں۔ ان سے اپنے ہی گھر میں یہ ڈراما کھلنا نہ دیکھا گیا۔ یہ آگ دل ہی دل میں سلگتی

رہی۔ مگر وہ اس وقت مصلحتاً خاموش رہیں۔

کافی دیر گزرنے پر نواب صاحب نے بیگم صاحبہ سے کہا، چلو اب تک دلہن کھانا کھا چکی ہوں گی۔ بیگم نے آکر دیکھا کہ نسرین نے نوالہ تک بھی نہ توڑا تھا۔ بلکہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہوئی کچھ سوچ رہی تھی۔ بیگم صاحبہ نے کھانا نہ کھانے پر بہت کچھ کہا سنا اور افسوس ظاہر کیا۔ جب کچھ جواب نہ ملا تو یہ کہہ کر اچھا بہن تمھاری مرضی، وہ کھانا باورچی خانے میں واپس پہونچا دیا۔ نوکر نے مسہریوں پر تمام بستر صاف کر کے لگا دیئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی نئی دلہن آنے والی ہے۔ مگر آج اس مکان میں یہ رنگ دیکھ کر نوکر کو حیرت تھی۔ کیونکہ خاص گھر ہی میں ایسا واقعہ پہلی بار پیش آیا تھا۔ گھر سے باہر کے بہت سے ایسے واقعات ہیں جن میں اسے شریک ہونا پڑا تھا مگر کیا کیا مجال کہ بیگم کو ہوا تک بھی پہونچی ہو۔ لیکن اس وقت گھر کی عزت و آبرو قائم و برقرار رہنے کی دعا مانگ رہا تھا۔ کیونکہ جہاں وہ نواب صاحب کا رازدار اور دل و جان سے خیرخواہ تھا وہاں بیگم صاحبہ کے لئے بھی ہر طرح بھلائی کا خواہش مند تھا۔ لیکن نواب صاحب کی ایسی حرکات کو دیکھتے ہوئے اس کو یقین تھا کہ کب تک یہ آنکھ مچولی کھلتی رہے گی، ایک نہ ایک دن کوئی گل ضرور کھل کر رہے گا۔ مشکل یہ تھی کہ اُس کے لئے دونوں برابر تھے۔ اگر بیگم صاحبہ کو ہوشیار کرتا تب مصیبت، نواب صاحب کے سامنے زبان سے اُف بھی کرتا تب بھی مصیبت۔ آخر کار یہ نشیب فراز سوچ کر خاموش ہی رہا کہ میں کسی سے کیوں بُرا بنوں۔ جو کچھ ہونا ہے وہ ضرور ہو کر رہے گا۔

نوکر اجازت لے کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ اور نواب صاحب دور کونے میں بچھی ہوئی مسہری پر لیٹ گئے۔ نسرین اور بیگم صاحبہ کی مسہریاں قریب قریب تھیں، لیکن نواب صاحب سے کافی فاصلے پر۔ پھر یہ دونوں بھی اپنی اپنی مسہری پر پہونچ گئیں۔ نوکر اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنے والا تھا کہ صدر دروازے پر کسی نے دستک دی۔ نوکر نے دروازہ کھولا تو ایک برقعہ پوش کو کھڑا پایا۔ پوچھا

آپ کون ہیں اور کس کو معلوم کرنا چاہتی ہیں۔

آنے والی برقعہ پوش زہرہ تھی۔ یہ سردار کے گھر میں نسرین کو پریشان دیکھ کر اُس سے وعدہ کر چکی تھی کہ خواہ کچھ بھی ہو میں تمھاری مدد کروں گی۔ اسی وعدے پر یہ سردار کے مکان پہنچی تو نسرین کو وہاں نہ پاکر اُس کی تلاش میں سردار کے تمام ٹھکانوں پر پہنچی مگر پتہ نہ چلا ——— صرف ایک یہی ٹھکانہ باقی رہ گیا تھا۔ رفتہ رفتہ یہاں پہنچ کر بھی دستک دی ——— زہرہ کی یہ جستجو نسرین کی ہمدردی اور محبت کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ وہ انتقامی جذبہ تھا جب سردار نے اُس کو نہایت ذلت و خواری سے اپنے گھر سے نکالا تھا۔ ورنہ یہی زہرہ نسرین کو سردار کی خواہشات کا شکار ہونے کے لئے آمادہ ہو جانے کی پوری کوشش کر چکی تھی۔ نسرین اس مصیبت کی حالت میں زہرہ کی باتوں سے مطمئن ہو کر اس کو غیبی امداد سمجھ رہی تھی۔

نوکر کے سوال پر اُس نے کچھ سوچا۔ پھر سنجیدگی سے بولی۔

سردار میاں کے گھر سے یہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ نہ معلوم وہ کونسا

مکان ہے۔ میں تلاش کرتے کرتے تھک گئی ہوں۔ اگر معلوم کر کے بتا دوگے تو بڑا احسان ہوگا۔ خدا تمھارا بھلا کرے گا۔

نوکر کو جب اُس نے دعا دی تو اُس کو ہمدردی ہوگئی۔ فوراً بولا۔

جی ہاں اُن کی دلہن آئی ہوئی ہیں۔

کیا نواب صاحب اندر ہیں؟

جی ہیں۔

بیگم صاحبہ نے نوکر کی کسی عورت سے بات کرنے کی آواز سنی تو ان کے کان ادھر لگ گئے۔ خیال آیا کہ کون ہے جو سردار کی دلہن کی تلاش میں یہاں تک آئی ہے۔ اس سے ضرور ملنا چاہیئے۔ یہ سوچ کر دروازے پر پہنچیں۔ برقعہ پوش کو دیکھ کر اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔

بی بی کہاں سے آئی ہو؟

برقعہ پوش نوکر کی موجودگی میں جواب دینے سے ہچکچائی۔ بیگم صاحبہ اس کی ہچکچاہٹ کو تاڑ گئیں۔ نوکر کو وہاں سے ہٹ جانے کے لئے اشارہ کیا۔ نوکر فوراً ہٹ گیا۔ بیگم نے پھر سوال کیا۔

ہاں بی بی اپنا مقصد بتاؤ۔

بیگم صاحبہ میں سردار میاں کی دلہن سے ملنا چاہتی ہوں۔

اس وقت تو وہ آرام کر رہی ہیں۔ صبح آنا۔ ابھی تو اُن کا قیام یہاں کئی روز رہے گا۔

یہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ یہ وقت آرام کا ہے۔ مگر بات ہی ایسی ہے

کہ جو اس وقت آئی ہوں۔

یہ بات سن کر بیگم صاحبہ چونک اُٹھیں۔ کچھ سوچ کر بولیں۔

کیا وہ تمھیں جانتی ہیں؟

جی ہاں، بہت اچھی طرح۔ مگر صرف دلہن کو۔

کیا مطلب؟

آپ ماشاء اللہ خود سمجھدار ہیں۔

اچھا ذرا یہیں ٹھہرو۔

یہ کہہ کر بیگم صاحبہ ماہرہ کو دروازے پر چھوڑ کر اندر گئیں۔ نواب صاحب ابھی تک جاگ رہے تھے۔ بیگم صاحبہ کی برقعہ پوش سے جو کچھ باتیں ہوئیں ان کو پوری طرح سمجھ تو نہ سکے۔ لیکن آوازیں اُن تک آتی رہیں۔ انھوں نے آنے والے کے بارے میں پوچھا، تو بیگم نے اُن کے قریب ہو کر پریشان لہجے میں آہستہ سے جواب دیا۔

پڑوس میں پتہ چل گیا ہے۔

اس بات کو سنکر نواب صاحب بوکھلا گئے۔ جلدی سے بولے۔

کس بات کا پتہ چل گیا ہے؟

یہی کہ ہمارے یہاں دلہن آئی ہوئی ہے۔ پڑوس والیاں دیکھنا چاہتی ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

کہیں اُن کا دماغ خراب تو نہیں ہو گیا۔ بھلا یہ وقت کوئی دلہن دیکھنے کا ہے کہ خواہ مخواہ پریشان کرنے کے لئے آ گئیں۔ ان کو کورا جواب دیکر ٹالدو

آپ مرد ہیں اس لئے ایسی باتیں کر رہے ہیں۔

اگر میں مرد نہ ہوتا تو ؟

وہی حال ہوتا جو دروازے پر کھڑی ہوئی پڑوسن کا ہے۔ مہربانی کر کے آپ ذرا دوسرے دالان میں چلے جائیں۔ تاکہ میں اُس کو اندر بلالوں۔

تو پردہ چھوڑ دو۔ یا میں کروٹ لے سکتا ہوں۔

ذرا کروٹ ہی لے لیجئے۔

بہت بہتر ہے۔ لیجئے۔

نواب صاحب نے کروٹ لے لی۔ بیگم صاحبہ نے پردہ بھی چھوڑ دیا۔ نسرین اور نواب صاحب کو کیا خبر تھی کہ بیگم ہم دونوں کی عقل پر پردہ ڈال رہی ہیں۔ پردہ ڈالنے کے بعد دروازے پر کھڑی ہوئی مصنوعی پڑوسن کو اندر بلا لیا۔ نسرین بھی نیچی نظریں کر کے سنبھل کر بیٹھ گئی۔ بالکل اُسی طرح جیسے کہ ایک نئی نویلی دلہن منہ دکھانے کے وقت بیٹھتی ہے۔ نسرین کا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اُس کو سردی سی چڑھتی جا رہی تھی۔ جوں جوں پڑوسن کے قدموں کی آوازیں اُس کے کانوں میں آ رہی تھیں سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ زہرہ بھی بڑی چالاک تھی اُس نے جو پوشاک دن میں پہن رکھی تھی وہ تبدیل کر دی تھی۔ برقعہ بھی کسی کا مانگ کر اوڑھ لیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو نسرین سے چھپانا چاہتی تھی۔ مصلحتاً نسرین کے سامنے کھلم کھلا ظاہر ہونا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اشارہ پا کر دالان میں پہنچ گئی۔ اُس نے ایک ہی نظر میں نسرین کو پہچان لیا اور فوراً ہی واپس لوٹ گئی۔ دلہن کو دیکھ کر نہ کچھ کہا اور نہ کچھ سنا۔ عجیب بات ہے کہ

بیگم صاحبہ بھی اس کے ساتھ دروازے تک آئیں۔ زہرہ سے پوچھا

کیوں بی بی دلہن کو دیکھ لیا؟

جی ہاں، خوب اچھی طرح۔

اس کا کیا مطلب؟

وہ آنے والا وقت بتائے گا۔ اب آپ سنبھل کر رہیں۔

کیا یہ وہی ہے جس کی تم کو تلاش تھی۔ نظروں کو دھوکا تو نہیں ہوا۔

بیگم صاحبہ ان آنکھوں نے دنیا دیکھی ہے، خدا کا شکر ہے کہ اب تک کبھی دھوکا نہیں کھایا۔ کل کی خبر نہیں۔

آخر یہ عورت کون ہے؟

آپ کے سہاگ کی دشمن۔

یہ سنکر بیگم صاحبہ دم بخود رہ گئیں سر چکرا گیا۔ پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ دل میں خیال آیا کہ نواب صاحب کی خوب خبر لے، مگر خاوند کی رسوائی یا احترام کی وجہ سے خاموش رہیں۔ زہرہ نے اور سوالات کا انتظار کیا۔ مگر بیگم کو بت کی مانند ساکت دیکھ کر چپکے سے چلی گئی۔ لیکن اتنا ضرور کہہ گئی موقع ملا تو دن میں آؤں گی۔ بیگم دروازے کے کواڑ بند کر کے واپس آکر اپنی سہری پر لیٹ گئیں۔ نسرین بار بار اُن کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ لیکن بیگم صاحبہ نے اپنی طرف سے کوئی بات اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ نوکر کو آواز دی کہ پردہ اٹھا دے۔ مگر نواب صاحب نے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ صرف اس لئے کہ بیگم کے دل میں ان کی نیت پر شبہ نہ گزرے۔ نوکر

نوکر خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر تک تو بیگم صاحب اپنی مسہری پر کھانستی رہیں۔ اور کروٹیں بدلتی رہیں۔ جب انھوں نے دیکھا کہ سردار کی دلہن بالکل خاموش لیٹی ہوئی ہے، جیسے کہ کوئی نیند میں مدہوش سوتا ہو تو کھانسنا اور کروٹیں بدلنا بند کر دیا، اور تھوڑی خاموش رہ کر خراٹے لینا شروع کر دئے۔ نواب صاحب کو انتظار میں ایک ایک منٹ پہاڑ معلوم ہو رہا تھا، بےچینی سے مچھلی کی طرح تڑپ رہے تھے۔ وہ بیگم صاحبہ کی نیند کے بارے میں شک کر رہے تھے۔ کافی دیر کے بعد جب خراٹوں کی آواز خوب تیز ہو گئی تو اُن سے نہ رہا گیا۔ دبے دبے پاؤں اپنی مسہری سے اُٹھے اور نسرین کی مسہری کے پاس جاکر کھڑے ہو گئے۔ آہستہ سے نسرین کے پاؤں کو پکڑ کر ہلایا۔ لیکن فوراً ہاتھ جھٹک دیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر یہی کیا تو نسرین کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے منہ سے بےساختہ نکلا۔

سردار خدا کے لئے مجھے جینے دو۔

نواب صاحب نے فوراً نسرین کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور آہستہ سے کان میں کہا۔

سردار یہاں کہاں ہے .... ہوش میں آؤ۔ میں ہوں۔ کھڑی ہو جاؤ۔

کیوں؟

یہ اُدھر چل کر بتاؤں گا۔

بیگم صاحبہ جاگ رہی ہوں گی۔

پرواہ نہ کرو۔ بڑی مست نیند سو رہی ہیں۔ اب تو صبح کی خبر لائیں گی۔ جو کچھ کہنا ہو ہمیں کہدو۔ میں اُدھر نہ جاؤں گی۔
ضد کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ہمیں خوش رکھو گی تو خوش رہو گی ورنہ پچھتاؤ گی۔

یہ سنکر نسرین کے دل پر چوٹ سی لگی۔ سوچا کہ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہوں۔ وہ عورتیں جن کو لوگ ذلیل ناموں سے پکارتے ہیں کیا اپنی خوشی سے کوٹھوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ یا خدا کے یہاں سے اُن پر مہر لگ کر آئی ہے کہ ان کو یہ پیشہ کرنا پڑے گا۔ یقیناً جو حشر میرا ہو رہا ہے ان کو بھی ایسے ہی سانحوں اور حالات سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔ اور وہ بھی ایسے ہی شریفوں کا شکار بنی ہوں گی۔ اگر نواب صاحب کی بات مانتی ہوں تو مجھ میں اور ایک کوٹھے والی میں کیا فرق رہا۔ اور انکار کرتی ہوں تو نواب صاحب سردار کو پوری کیفیت خوب نمک مرچ لگا کر سنائیں گے پھر سردار میاں کا عتاب مجھ پر کیسا ہوگا وہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ نواب صاحب جو کچھ چاہتے ہیں سردار کی رضامندی اور منظوری سے۔ ورنہ مجھے یہاں چھوڑ کر جانے کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ وہ اسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اور نواب صاحب اس کے منتظر تھے کہ وہ اُٹھ کر خوشی خوشی ان کے ساتھ چلے۔ مگر نسرین ٹس سے مس تک نہ ہوئی۔

کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد نواب نے جرأت کر کے نسرین کا ہاتھ پکڑا اور طاقت سے اسکو مسہری سے اُٹھا کر اپنی مسہری کی طرف چل دئے۔

نسرین بہت کچھ انکار کرتی رہی مگر بیگم صاحبہ کے جاگ جانے کے خوف سے خاموشی سے جبراً ساتھ چلی گئی۔ بیگم صاحبہ کی مسہری نواب صاحب کی مسہری سے کافی دور تھی۔ وہ اپنی مسہری سے اُٹھ کر دبے دبے پاؤں پردے کے قریب آکر کھڑی ہو گئیں۔ اور پوری توجہ ان کی طرف کر دی۔ نسرین اور نواب صاحب مسہری پر بیٹھ گئے۔ لیکن ان دونوں پر بیگم صاحبہ کا خوف سوار تھا۔ کچھ دیر کے بعد طبیعت کو سکون ہوا تو نواب صاحب نے نسرین کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔

نسرین یہ تمھاری خوش قسمتی ہے کہ مجھ تک پہنچ گئیں۔

بجا فرمایا۔ خوش قسمتی تو ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔

نسرین یہ کیا کہہ رہی ہو۔

جو کچھ اس وقت ہو رہا ہے یہ خوش قسمتی نہیں تو اور کیا ہے۔

یہ حقیقت ہے۔ میرے کہنے پر چلوگی تو یہ جو کچھ نظر آرہا ہے سب اپنا ہی سمجھو۔ اور تم اگر چاہو تو بیگم بھی بن سکتی ہو۔

یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ بیگم کا خطاب بیگم کو مبارک۔ البتہ اگر خادمہ کی حیثیت سے اپنے یہاں پناہ دے کر رکھیں تو بہت بہتر ہو۔

تم خود کو اتنی ذلیل سمجھتی ہو۔ ہیرے کی قدر جوہری ہی جانتا ہے۔ تم میں ملکہ بننے کی صفات دیکھ رہا ہوں۔ یقیناً تمھاری گردش کا زمانہ ختم ہو چکا اب ہمیشہ کے لئے عیش ہی عیش ہے۔

لیکن میں اس عیش کو پسند نہیں کرتی۔ زمانے کی گردش سے تنگ آکر

ہیں قطعی فیصلہ کر چکی ہوں کہ اس موذی دنیا اور دُکھ بھری زندگی سے جلد از جلد نجات پا جاؤں۔

خدا کے لئے ایسا مت کہو۔

میں جو کچھ کہہ رہی ہوں درست ہے اور یہ فیصلہ اٹل ہے۔

اتنا کہنے کے بعد نسرین پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نواب صاحب نے بیقرار ہو کر اُس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ بیگم صاحبہ پردے کے پیچھے سے یہ ڈراما دیکھ ہی دیکھ رہی تھیں۔ غصّہ سے بیتاب ہو کر ایک دم سامنے آکر کڑک کر بولیں۔

بس خبردار۔

ان کو دیکھتے ہی نسرین اور نواب صاحب گھبرا کر الگ الگ ہو گئے۔

میں نے سب کچھ دیکھ لیا۔ جو شبہ میرے دل میں کھٹک رہا تھا وہ صحیح نکلا۔ سنو یہ ایک شریف گھرانہ ہے۔ یہاں کسی صورت سے یہ کھیل نہیں کھیلا جا سکے گا۔

نسرین کانپتی ہوئی مسہری سے اُٹھی اور بیگم صاحبہ کے پیروں میں گر کر کہنے لگی۔

بیگم صاحبہ خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ آپ جیسا سمجھ رہی ہیں وہ غلط ہے۔ میں بے قصور ہوں۔ میں آپ کو خدا کا واسطہ دیتی ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔

بیگم صاحبہ اس وقت غصہ سے کانپ رہی تھیں۔ چہرہ تمتما رہا تھا۔

ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ نسرین کی باتوں پر اور بھی بھڑک گئیں۔ نسرین کو ٹھوکر لگاتے ہوئے بولیں۔

دور ہو کم بخت میری نظروں کے سامنے سے۔ ورنہ ابھی کچا چبا ڈالوں گی۔ اب اپنے آپ کو بے گناہ بتا رہی ہے۔ عورت ہوتے ہوئے دوسری عورت کے سہاگ کو ہڑپ کرنا چاہتی ہے۔ تو عورت نہیں ڈائن ہے۔ تجھ کو اپنے کئے کی سزا بھگتنی ہوگی۔ وہ سزا ایسی دی جائے گی جو تمام عمر یاد رکھے گی، اور دوسروں کو عبرت کا سبق دے گی۔ تاکہ آئندہ کسی ایسا کرنا تو درکنار بلکہ خیال سے بھی کانپ جائے۔

نواب صاحب نے دیکھا کہ بیگم آپے سے باہر ہوتی جا رہی ہیں، اس خوف سے کہ ان کے شور وغل کی آواز سن کر دروازے پر پڑوسی نہ جمع ہو جائیں عاجزانہ صورت بنا کر بیگم کے پیروں پر گر کر کہنے لگے۔

بیگم اب تک میں نے جو کچھ کیا خدا کے لئے اس کو معاف کر دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب تمام عمر ایسی شکایت کا موقعہ نہ دوں گا۔

کاش پہلے ہی سوچ لیتے۔

تمہاری بات بالکل درست ہے۔ اگر ایسی غلطی نہ ہوتی تو یہاں تک نوبت کیوں پہنچتی۔ انسان ٹھوکر کھا کر ہی سنبھلتا ہے۔ میری عزت تمہاری عزت ہے۔ سننے والے اگر مجھے نفرت سے دیکھیں گے اس سے تمہیں بھی دکھ ہوگا۔

یہ خیال ہوتے ہوئے پھر میرے ساتھ یہ سلوک۔

اس غلطی کا اقرار ہے کہ واقعی قصور ہوا۔ اب معاف کر دو۔

بیگم نے خاوند کو اتنا عاجز و نادم دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی، اور اپنی مسہری پر جا کر لیٹ گئیں۔ نواب صاحب یہ دیکھ کر کہ بیگم کہنا مان گئی ہیں نوکر کو بلا کر حکم دیا کہ اس عورت کو ابھی جا کر سردار کے مکان پر چھوڑ آئے۔ نواب صاحب کا حکم سنتے ہی نوکر نسرین کو لے کر سردار کے مکان کی طرف چل دیا۔ وفادار اور خیر خواہ نوکر دل میں کہتا جا رہا تھا کہ کسی نے سچ کہا ہے سو دن چور کے ایک دن سادھو کا رکا۔ یہ کہاوت آج پوری ہو گئی۔ ہمارے نواب کی یہ حرکتیں بہت بڑھ چکی تھیں۔ بیگم صاحبہ بڑی ہوشیار ہیں۔ ایک ہی موقع ملنے پر میاں صاحب کو سیدھا کر دیا۔ انھوں نے گھر کو تباہی سے بچا لیا۔ ایسے ایسے واہیات لوگوں نے نواب صاحب کو اپنے راستے پر لگا کر ایسا بے حس کر دیا تھا کہ خاص اپنے مکان ہی میں عیاشی کا رنگ جمانے پر اتر آئے۔

انھیں خیالات میں پورا راستہ طے کر لیا۔ سردار کے مکان پر پہنچ کر آواز دی۔ سردار باہر آیا تو نسرین کو دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔ نوکر نے نسرین کو اس کے حوالے کر کے یہ داستان بھی سنا ڈالی۔ اس سے سردار پر اور بجلی گر پڑی۔ سردار کے لیے نواب صاحب کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا۔ اس کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا، آمدنی کے جو کچھ منصوبے باندھ رکھے تھے وہ خاک میں مل گئے۔

تنگ دستی کے باعث سردار کے عیش و آرام میں فرق آ جانے سے غصہ بڑھ گیا۔ وہ نسرین پر طرح طرح کے مظالم ڈھانے لگا۔ حالانکہ اب گھر کی ضروریات نسرین ہی کی آمدنی سے پوری ہو رہی تھیں۔

نسرین اس کو خوش کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ۔ اُس کے ہر ظلم وستم کو برداشت کرتی ۔ لیکن اُس کے سخت دل پر ذرا بھی اثر نہ ہوتا ۔ اکثر وہ اپنے خاندانی وقار اور پچھلی شاندار زندگی کو یاد کرتی تو روتے روتے تمام رات گزار دیتی ۔ آخر میں اپنی حالت کی ذمہ دار اپنے ہی کو ٹھہراتی کہ خود کردہ را علاجے نیست ۔

اب اُس کی نظروں میں دنیا اندھیر تھی ۔ اپنی دکھ بھری کہانی کس کو سنائے ۔ اور اس مصیبت سے نجات پانے کے لئے کس کو مددگار اور ہمدرد بنائے ۔ اس کا حل سمجھ میں نہ آتا تھا ۔

نواں باب

تجربہ شاہد ہے کہ سنجیدہ سے سنجیدہ انسان کسی موذی کی چکنی چپڑی باتوں پر اس قدر یقین کر بیٹھتا ہے کہ پھر کسی کی معقول باتیں بھی اُس کے خیال کو بدلنے میں ناکام رہتی ہیں۔ سردار نے دوستی کے پردے میں افضل پر شکیلہ کا فریب ظاہر کرکے اس کی زندگی برباد کرنے کے لئے بھرپور وار کردیا تھا۔ اگرچہ سردار کو کوئی فائدہ بھی نہ پہنچا جو اُس کا خاص مقصد تھا۔ مگر افضل کو شکیلہ سے نفرت ہو ہی گئی تھی۔ اب نسرین کا خیال اس کے دل و دماغ پر مسلّط ہو چکا تھا۔ شکیلہ نے بہت کوشش کی کہ افضل کے خیال کو بدل دے مگر وہ اتنا موقع ہی نہ دیتا تھا کہ اُس کی سنے۔ اسی حالت سے دو ماہ گزر گئے۔ اب عنقریب شکیلہ ایک بچّے کی ماں بننے والی تھی جس کا علم افضل کو بھی تھا، مگر وہ اُس کو بھی نظر انداز کرچکا تھا۔ نکاح سے پہلے جتنے وعدے کئے گئے تھے ان کو ایک دم فراموش کردیا۔

شکیلہ کو بار بار اس کا خیال آتا مگر دل مسوس کر رہ جاتی۔ آخر کار جب صبر نہ ہو سکا تو ایک دن موقع پا کر افضل کے پاؤں پکڑ کر بولی۔

ایک عرض سن لیجئے۔

مجھے اس وقت فرصت نہیں۔ پھر دیکھا جائے گا۔

جب آپ فرمائیں۔

اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اتنا کہہ کر افضل نے اپنی شیروانی پہنی اور چھڑی ہاتھ میں لے دفتر کا راستہ لیا۔ بے چاری شکیلہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ تمام دن رو رو کر گزارا۔ افضل کے نوکر جالو کو شکیلہ اس حالت پر ترس کھا کر افضل کو سمجھایا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ جالو کو اصل واقعہ کا بالکل علم نہ تھا۔

میاں بیوی کی اس رنجش سے کوٹھی میں اداسی چھائی ہوئی تھی۔ چہروں کی رونق اور آب و تاب ختم ہو گئی تھی۔ اب شکیلہ کو ماں بننے میں ایک ماہ کا عرصہ باقی رہ گیا تھا اس کے دل میں جو اُمنگیں بچے کے لئے موجزن تھیں وہ مٹ چکی تھیں۔ اس کی بابت بھی کئی بار افضل کو توجہ دلائی مگر بے علمی ظاہر کر کے جواب دیا

میں کسی کے بار کو کیوں برداشت کروں۔ اور تمہاری بھلائی اس میں ہے کہ اپنے لئے کوئی دوسرا ٹھکانا تلاش کر لو۔ یہاں پر تمہارا وجود میرے لئے تکلیف دہ بنا ہوا ہے

یہ کڑا جواب سنکر شکیلہ کانپ اٹھی۔ مگر زبان سے اُف تک نہ کی۔ اسی

حالت میں جب کافی دیر ہو گئی تو افضل اُسی بے رخی سے بولا

تم نے مجھے فریب دیا کہ یہاں آکر اپنا نام نسرین بتایا۔ مجھے بے وقوف بنا کر اپنے جال میں پھانسا۔ اگر سردار نہ بتاتا تو بے وقوف بنا رہتا۔ نسرین جس نے میری خاطر اپنے عزیز و اقربا چھوڑے۔ خاندان کی عزت کو دھبہ لگایا بے چاری ٹھوکریں کھاتی پھر رہی ہے۔ اب میں اس کی تلاش میں ہوں۔ خدا نے چاہا ایک نہ ایک دن اُس کو پا کر رہوں گا۔

میرے لئے کیا سوچا؟

مجھے ضرورت نہیں۔ تم اپنے لئے بہتر سوچ سکتی ہو۔

آپ پہلے روز مسجد کے سامنے ایک وعدہ کیا تھا۔

کیا تھا، اب کیا انکار کرتا ہوں۔

آپ نے تمام عمر ساتھ دینے کو کہا تھا لیکن ایک سال بھی نہ نبھایا۔

ہاں وہ وعدہ نسرین سے کیا تھا۔ جب نسرین نہیں تو وعدہ کہاں۔

شکیلہ کو بھی نسرین سے محبت تھی۔ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ نسرین ٹھوکریں کھاتی پھرے یا اُس کی زندگی تباہ ہو۔ نسرین کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا اس میں شکیلہ کو دخل نہ تھا بلکہ سردار نے مکاری سے اپنے جال میں پھنسایا۔ شکیلہ نے جس وقت نسرین کے بارے میں سنا وہ ایک دم پھڑک اُٹھی۔ وہ اکثر سوچا کرتی تھی کہ نسرین کہاں گئی اور کس حال میں ہے۔ اس کو زندہ سن کر باغ باغ ہو گئی بلکہ اپنی پریشانی کو بھول گئی۔ اب خود چاہتی تھی کہ نسرین جس کے لئے نکلی تھی اس کی ہی ہو کر رہے۔ شکیلہ انہی خیالات میں غرق تھی کہ

افضل نے پھر سوال کیا۔

خاموشی سے کام نہ چلے گا۔ جلد جواب دو۔

جی بات بالکل درست ہے۔ اور آپ کا فیصلہ بھی صحیح ہے۔ لیکن آپ کو یہ یقین کیسے دلاؤں کہ میں نے فریب نہیں دیا۔

بالکل جھوٹ۔ تم نے محض اپنے آرام کے لئے مجھے بے وقوف بنایا ہے۔

یہ سب کچھ اس وقت ہوا کہ یہاں نسرین کو نہیں پایا۔ ورنہ میری کیا مجال تھی کہ ایسا قدم اٹھاتی۔

افضل کے دل پر شکیلہ کی یہ بات اثر کر گئی۔ وہ شکیلہ کی داستان جو کہ سنانا چاہتی تھی سننے کے لئے تیار ہو گیا۔ شکیلہ نے شروع سے آخر تک تمام روداد سنائی۔ یہ سنکر افضل نے شکیلہ کا منہ قبلہ کی طرف کرکے کہا۔

اس وقت تم قبلہ رو بیٹھی ہو، اگر جھوٹ بولا تو غضب میں پھنس جاؤگی تم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ بالکل درست ہے یا من گھڑت ہے۔

جی بالکل درست ہیں۔ نسرین آجائیں گی تو اس کی تصدیق کر دیں گی۔

سردار نے بتایا تھا کہ وہ میر صاحب کے یہاں رہتی ہے۔ میں کئی بار جا چکا ہوں مگر کوئی نیا آدمی وہاں نہیں دیکھا۔ شاید وہ سامنے نہ آئی ہو۔

آپ مجھے وہاں لے چلیں میں بھائی جان سے پوچھ لوں گی۔

اگر وہاں نہ ملی۔

شاید وہ کوئی پتہ بتا دیں۔

بالکل درست کہتی ہو۔

یہ تو بتائیے کہ نسرین کو پالینے کے بعد میرا کیا بنے گا؟
میں اُس سے شادی کر لوں گا۔ تمھارے بارے میں ابھی کچھ نہیں جانتا۔
یہ سنکر شکیلہ گہری سوچ میں پڑ گئی۔ اُس کو نسرین کی طرف سے اچھی توقع تھی لیکن افضل کی طرف سے اطمینان نہ تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ نسرین کے آنے کے بعد میری طرف دیکھنا بھی پسند نہ کرے گا۔
افضل تاڑ گیا کہ شادی کے نام سے شکیلہ کے دل پر چوٹ لگی ہے۔ کوئی بھی عورت اپنے سہاگ میں دوسری عورت کی شرکت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لیئے اُس نے یہی مناسب سمجھا کہ نرمی اختیار کی جائے۔ تاکہ نسرین کے حصول میں رکاوٹ نہ ڈالے۔ اُس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔
شکیلہ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو میری بات سے دُکھ ہوا ہے۔
یہ سنکر شکیلہ کا دل بھر آیا آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اُس نے اپنے دانتوں کو زور سے بھینچ لیا کہ چیخ نہ نکل سکے۔ اس کی ہچکی بندھ گئی۔
یہ دیکھ کر افضل سے بھی نہ رہا گیا آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے لگے، بولا
شکیلہ میں مجبور ہوں۔ میرے خاندان والے جب سنیں گے کہ میری شادی تمھارے ساتھ ہوگئی ہے تو اتنے برسیں گے کہ پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیئے میں نسرین کے ساتھ شادی ضروری سمجھتا ہوں۔
آپ کو شادی سے کون روک سکتا ہے۔ ضرور کیجئے۔ مگر ایک معصوم جو عنقریب دنیا میں آنے والا ہے اس کے لیئے کیا فیصلہ کیا ہے۔
کچھ نہیں بتا سکتا۔

آپ اپنے پر پھر غور کر لیں کہ ایک معصوم اور بے گناہ کو دنیا میں آنے سے پہلے سزا دی جا رہی ہے۔ اگر نسرین سے ہوتا تو اُس پر یہی عتاب ہوتا؟

بالکل نہیں۔

اپنی لاج کی خاطر ایک زندگی کو تباہ کر رہے ہیں۔ خدا کے لئے ایسا نہ کیجیے اور اس کا حل تلاش کیجیے۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

اتنی عجلت سے کام نہ لیجیے۔ نسرین کو حاصل کرنے تک شاید کوئی حل نکل آئے۔ ورنہ جیسا آپ فرما رہے ہیں اس پر عمل کیا جائے گا۔

چلو ایسا ہی سہی۔

تو آپ بھائی جان کے یہاں کب چلیں گے۔

آج تو میں کافی تھکا ہوا ہوں۔ کل دفتر سے واپسی پر چلیں گے۔

رات اسی سوچ بچار میں بیت گئی کہ خاندان والوں کو جب میری شادی شکیلہ سے ہو جانے کی خبر پہونچے گی تو ایک کہرام برپا ہو جائے گا۔ کس کس کے اعتراضات کا جواب دوں گا۔ بس اسی میں عافیت ہے کہ یہ سبب ہی ختم ہو جائے۔

صبح دفتر پہونچے تو رات بھر جاگنے کے کسل اس الجھن اور پریشانی سے چہرہ اترا ہوا تھا۔ دفتر کا کام شروع ہوئے دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ افضل کی میز پر فائلوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ چپراسی سمجھ گیا کہ آج ضرور کوئی حادثہ پیش آیا ہے جو اب تک فائلوں کو دیکھا تک نہیں۔ چہرہ بھی بتا رہا ہے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ گھنٹی بجی چپراسی فوراً اندر آیا افضل نے کہا۔

یہ تمام فائل فی الحال الماری میں بند کر دو۔

سر کا دستخط ہو کر بڑے صاحب کے سامنے جائیں گے، وہ ان فائلوں کا انتظار کر رہے ہیں۔ کئی بار اُن کا چپراسی آچکا ہے۔

میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ کرو۔

بہت اچھا

چپراسی فائلوں کو الماری میں رکھ کر برآمدے میں اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا دو منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ بڑے صاحب کا چپراسی فائلوں کے لئے پھر آدھمکا افضل نے جوں ہی اُس کو دیکھا تو سخت لہجے میں بولا

جاؤ کہدو کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔

وہ چپ چاپ واپس ہو گیا، اور صاحب کو یہ جواب سنا دیا۔

صاحب نے پھر حکم دیا کہ

مرزا صاحب کو بلا لاؤ۔

چپراسی پھر فوراً واپس آیا، بولا

آپ کو صاحب یاد فرما رہے ہیں

کہنا ابھی آتا ہوں۔

چپراسی چلا گیا۔ افضل نے سوچا کہ شاید صاحب نے کام رک جانے کی وجہ سے طلب کیا ہے۔ مجبوراً کرسی سے اُٹھا اور نیچی نظریں کئے صاحب کے کمرے میں داخل ہوا۔ صاحب صورت دیکھتے ہی تاڑ گیا چشمہ درست کرتے ہوئے بولا۔

آئیے، مرزا صاحب کیسی طبیعت ہے؟

جی بالکل درست ہوں۔

ہم سے چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ تمھارا چہرے پر اداسی برس رہی ہے۔

افضل خاموش ہوگیا۔

تھوڑے دنوں کے لئے یہاں سے باہر جاکر آب وہوا تبدیل کرآؤ۔

میں بھی محسوس کررہا ہوں۔ جب آپ چھٹی دیدیں گے۔

چھٹی کی ضرورت نہیں۔ کلکتہ سے آج ہی دفتر میں اطلاع آئی ہے کہ پورٹ پرچار ماہ کے لئے ایک ہوشیار اور محنتی آدمی کی ضرورت ہے۔ ہمارے دفتر میں صرف تم ہی اس کے اہل نظر آتے ہو۔ آب وہوا بھی تبدیل ہوجائے گا اور تنخواہ بھی یہاں سے زیادہ ملے گی۔

لیکن میں مجبور ہوں۔

تمھیں ہی جانا پڑے گا۔ ہم لکھ چکے ہیں۔

یہ سنکر افضل دم بخود رہ گیا۔ افسر کے حکم پر سر جھکانا پڑا۔ صاحب نے تیاری کا حکم دیدیا کہ ایک قافلہ شام کو کلکتہ کے لئے روانہ ہوگا اس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوجاؤ۔ اس وقت افضل کو پریشانیوں کے ہجوم نے گھیر لیا تھا۔ اس نے سوچا کہ جو کچھ ہونا تھا ہوگیا، خدا کو یہی منظور تھا۔ شکیلہ کی جگہ چھین کر نسرین کو دینا ظلم ہوگا۔ چنانچہ اپنی تنخواہ شکیلہ کے نام لکھواکر اپنی کوٹھی پر آیا۔ شکیلہ کو اپنے شیماسے آگاہ کرکے کلکتہ جانے کا حکم سنایا۔ ساتھ ہی یہ بھی ہدایت کی کہ ہر ماہ تنخواہ میں سے وہ رقم جو ماں باپ کے پاس بھیجی جاتی ہے آئندہ بھی بھیجنا۔ اس کے بعد روانگی کی تیاری شروع کردی۔ بھالو کے ہاتھ مہر صاحب کو بلوا لیا۔

اور ان کو گھر کی ذمہ داریاں سونپ دیں۔ اتنے میں سرکاری گھوڑا گاڑی آ گئی جمالو نے افضل کو اطلاع دی۔ یہ سنکر شکیلہ کی چیخ نکل گئی۔ میر صاحب کا دل بھی بھر آیا، یہ دیکھکر افضل کی آنکھیں بھی نہ رہ سکیں۔ سامان سفر گاڑی میں رکھا گیا با دل ناخواستہ خدا حافظ کہتا ہوا سوار ہو گیا۔ گاڑی روانہ ہو گئی۔ شکیلہ اس وقت تک دروازے پر کھڑی رہی جب تک گاڑی نظر آتی رہی۔ افضل بھی شکیلہ کو برابر تکتا رہا۔ جب گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی شکیلہ با چشم پرنم واپس کمرہ میں آ کر نڈھال ہو کر مسہری پر لیٹ گئی۔ میر صاحب سے شکیلہ کی یہ حالت نہ دیکھی گئی شکیلہ سے کہا

بہن بھائی صاحب کے اچانک چلے جانے کا واقعی تم کو بہت رنج ہے۔ اور اس کوٹھی میں تنہائی سے جی بھی گھبرائے گا، اگر مناسب سمجھو تو اپنی بھاوج کے پاس چلی چلو، وہاں دل بہل جائے گا۔

بھائی صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ۔ مگر بھری کوٹھی کو سونی چھوڑنا بڑی غلطی ہے۔

یہ بھی درست ہے۔ اچھا تو میں اپنی خادمہ کو بھیجتا ہوں، بھائی صاحب کی واپسی تک وہ تمہارے پاس رہے گی۔

بہت بہتر ہے۔ جمالو کو بھیجئے اس کے ساتھ آ جائے گی۔

میر صاحب جمالو کو اپنے ساتھ لے گئے اور خادمہ کو اسکے ساتھ بھیجا۔ شکیلہ انتظار کر رہی تھی۔ جوں ہی خادمہ کوٹھی میں داخل ہوئی شکیلہ اس کو دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔ جب جمالو اپنے کمرے میں چلا گیا تو شکیلہ نے خادمہ کو سینے

پاس بلا کر بٹھایا، اور کہا
پہچانتی ہو مجھے؟
جی نہیں۔
پہچاننے کی کوشش کرو۔
خادمہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے، اس کی آواز پر شبہ ہو رہا تھا کہ یہ آواز شکیلہ کی معلوم ہوتی ہے مگر گردشِ زمانہ نے اس کی طبیعت کو اتنا پست کر دیا تھا کہ صاف بات کہنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ خاموش ہو گئی۔
ہاں بولو۔ ڈرو نہیں۔
واقعی میں نہیں پہچان سکی۔ خود ہی فرما دیجیے۔
تمھارا نام نسرین ہے نا، اور تم نواب صاحب کی صاحبزادی ہو۔
یہ سنکر نسرین پر پانی سا پڑ گیا۔ اگر انکار کرے تو بے سود۔ نیچی نظریں کرکے دبی آواز سے بولی۔
آپ درست فرما رہی ہیں۔
سنو۔ میرا نام شکیلہ ہے۔ وہی تمھاری خادمہ اور نمک خوار۔ آؤ میرے گلے سے لگ جاؤ۔
نسرین اور شکیلہ باہم گلے مل کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ جب خوب دل کی بھڑاس نکل گئی تو ایک نے دوسری کو اپنی داستان سنائی۔ اس کے بعد شکیلہ نسرین کی حالت پر افسوس اور نسرین شکیلہ کی حالت پر رشک کرتی رہیں۔